مضامینِ واقف عظیم آبادی

اکبر امام کاشف

مضامینِ واقف عظیم آبادی

مضامینِ واقف عظیم آبادی

مرتب

اکبر امام کاشف

نام کتاب	:	مضامینِ واقفؔ عظیم آبادی
مرتب	:	اکبر امام کاشفؔ
سالِ اشاعت	:	۲۰۰۶ء
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
قیمت	:	۱۲۵/روپے
ناشر	:	علامہ واقف اکادمی، پٹنہ
کمپوزر	:	تنویر احمد، عالم گنج، پٹنہ

ملنے کا پتہ

اکبر امام کاشف

معرفت حاجی عبدالمنان صاحب

ہارون نگر کالونی، سیکٹر-۲، پھلواری شریف

موبائل: ۹۳۳۴۳۹۲۳۰۱

انتساب

والدہ محترمہ سیدہ شاکرہ خاتون

کے نام

جن کی تربیت نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اردو کی خدمت کرسکوں۔

فہرستِ مضامین

تقریب

سید شاہ فضل امام واقفؔ عظیم آبادی جنہیں لوگ علم اور مرتبہ کی وجہ سے علامہ واقفؔ کے نام سے یاد کرتے ہیں، متعلقہ سرزمین کی ایک پر بہار اور پر وقار شخصیت کا نام ہے جو خود تو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے لیکن اپنی گراں بہا نگارشات کا ایسا سرمایہ چھوڑ گئے جسے نہ صرف یادگارِ واقفؔ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے بلکہ سیاست، تہذیب اور شعر و شاعری کے ضمن میں ایک قیمتی تحفہ کے طور پر محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

علامہ شاہ فضل امام واقف بنیادی طور پر ایک شاعر تھے جن کی نگاہیں ہمیشہ وا رہتی تھیں۔ اس طرح کہ وہ حالات و کوائف کی ناہمواریوں کو اپنے ذہن و دماغ میں نقش کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثری تحریریں کسی ایک موضوع میں بند نہیں۔ عظیم آباد اور ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور ادبی صورتوں کی واقفیت کے لئے ان کی نگارشات کی طرف مسلسل رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک طرف تو حساس شاعر کے دھڑکتے اور مضطرب دل کی کیفیات ہیں تو دوسری طرف وہ شیڈس ہیں جو ایسے اضطراب اور احساس کی عقبی زمین ہیں۔

کچھ دن پہلے علامہ واقفؔ کے کلام کا تھوڑا سا حصہ ''لطف ستم'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے لیکن اس میں موصوف کا تمام کلام موجود نہیں۔ دراصل علامہ ایک زود گو شاعر تھے اور ان کی شعری جہات متنوع تھیں۔ بہت سے رسالوں اور اخباروں میں ان کی تخلیقات بکھری پڑی ہیں جنہیں سمیٹنا نہ صرف ان کے خانوادے کے لوگوں پر فرض

ہے بلکہ ایسی کارکردگی سے اردو کی بھی خدمت کا جواز نکلتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ علامہ کے اکلوتے صاحبزادے جناب اکبر امام کاشفؔ اس کام سے وابستہ ہو چکے ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ حضرت علامہ کا شعری اور نثری کارنامہ کلّیات کی شکل میں سامنے آ جائے گا، انشاءاللہ۔

زیرِ نظر مسودہ چند ایسے مضامین پر مشتمل ہے جنہیں علامہ فضل امام واقفؔ لکھتے اور چھپواتے رہتے تھے۔ ان کی کیفیت ایک جیسی نہیں ہے۔ مختلف عنوانات کے یہ مضامین زندگی کی متنوع کیفیات پر محیط ہیں جن میں خارجی احوال و کوائف تو ہیں ہی داخلی مضمرات بھی ہیں۔ فہرست پر ایک نظر ڈالئے تو ایسا لگتا ہے کہ مختصر کینوس میں انہوں نے زندگی کی کتنی ہی ناہمواریوں کو سمیٹ لینے کا حوصلہ کیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں ان میں تہذیبی، ثقافتی، ادبی اور سیاسی پہلوؤں کے مختلف جہات سامنے آ گئے ہیں۔ علامہ زبان و بیان پر غایت دسترس اور قدرت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں الفاظ اُبلتے ہوئے چشمے کا منظرنامہ پیش کرتے ہیں، ان کی روانی دیدنی ہے۔ علامہ کی نثر میں سوز کے ساتھ تمکنت بھی ہے۔ قولِ محال استعمال کرنے کے گر سے وہ واقف ہیں۔ آئرنیکل سچویشن پیدا کرنے میں ان کا جواب نہیں لہٰذا ان کی نثر طنز اور مزاح کا آمیزہ پیش کرتی ہے۔ ان کے مزاح میں طنز ایک چھپی ہوئی ٹیس کی طرح ہے جسے حسّاس قاری فوراً محسوس کر لیتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ علامہ فضل امام واقفؔ کی یہ تحریریں اشاعت پذیر ہو کر عوام و خواص کے لئے گنجِ گراں مایہ ثابت ہوں گی۔ میں عزیزی اکبر امام کاشفؔ کی محنت کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے والد کی تمام تحریروں کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی ٹھانی ہے، جس کی پہلی اینٹ زیرِ نظر کتاب ہے۔

ہارون نگر، سیکٹر-۲
پھلواری شریف، پٹنہ

وہاب اشرفی
۱۰/ جون ۲۰۰۶ء

کچھ اس کتاب کے بارے میں

ضرورت اس بات کی تھی کہ میں اپنا خاندانی شجرہ پیش کرتا اور ثابت کرتا کہ یہ ذرہ کس آفتاب کی چمک دمک سے معمور ہے۔ لیکن آفتاب اپنی دھج دکھا کر غروب ہو چکا ہے اور تاریکی میرے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن میرے ملنے والے نہ معلوم کیوں ابھی بھی یہ کہتے ہوئے نہیں چوکتے کہ بوئے بلخ ابھی باقی ہے۔

یہ تو گفتنی ناگفتنی کے ذیل کے امور ہوئے۔ فی الحال مجھے اپنے ابا جان کی نگارشات کی اشاعت مقصود ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے میں نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ وہ سرمایہ جو حضرت چھوڑ گئے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائے۔

زمینداری اور امارت کے خاتمہ کے بعد جب ہم دَر دَر بھٹکنے لگے تو ابا مرحوم بھی سکون سے نہ رہے۔ اضطراب ان کا مزاج تھا، شاہ خرچی ان کا موقف اور حالات اتنے ناخوشگوار، لیکن وہ تو علامہ تھے لہٰذا اضطراب اور انتشار ان کی قوتِ تخلیق و تنقید کو کجلا نہ سکی۔

پڑھنے والے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کون ہوں اور کن کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میری درخواست ہے کہ اوپر کے سطور میں کوئی ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہو تو مجھے معاف کیا جائے۔

میں حضرت سید شاہ فضل امام واقفؔ عظیم آبادی کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ حضرتِ واقفؔ نہ صرف یہ کہ میرے والد تھے بلکہ سرزمین بہار کے لئے ایک ایسی شخصیت تھے جن کے تبحر علم

اور تخلیقی قوت کے بھی مداح تھے۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز جھیلتے ہوئے شعر و ادب کے سرمائے میں اضافے کی لگن کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ موصوف کی پیدائش سوسنہ ارول ضلع گیا میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی اور وفات آرہ میں ۷؍ستمبر ۱۹۹۳ء کو ہوئی۔ گویا اتنے سال زندگی ادبی طور پر بے حد فعال رہی لیکن زندگی کے معمولات ہمیشہ پراگندہ رہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی قابل قدر شاعری اور دلکش نثر کے مسودات کو ایک ترتیب کے ساتھ کہیں رکھنے کے بارے میں کبھی کوئی فکر نہ کی۔ کاغذات شیروانی کی ایک جیب سے دوسری جیب میں منتقل ہوتے ہوتے صفحۂ ہستی سے ہی معدوم ہو جاتے لہٰذا ایک بہت بڑا خزانہ یوں ہی ضائع ہو گیا۔ میں اپنی کمسنی اور کم عمری میں ایسے سرمائے کو کیا اہمیت دیتا۔ اب جب کہ بکھرے ہوئے اخبارات و رسائل و جرائد کی چھان پھٹک کر رہا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جو بچ گیا ہے وہ بھی کم نہیں ہے۔ حضرتِ والد مرحوم کا ایک نامکمل شعری مجموعہ ''لطف ستم'' کے نام سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس میں حضرت علامہ واقفؔ کا پورا کلام موجود نہیں ہے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ذرا ٹھہر کر کچھ اور محنت کی جاتی اور اس سلسلہ کے جو کلام جہاں اب بھی محفوظ ہیں اسے حاصل کیا جاتا۔ اب میں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ابا مرحوم کے تمام شعری سرمائے کو جو ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں جمع کر کے مرتب کر لوں۔ اور پھر ایک ضخیم شاعرانہ کلام ایک جگہ اشاعت پذیر ہو۔ میرا کام جاری ہے اور انشاء اللہ بہت جلد ویسا مجموعہ بھی سامنے آ جائے گا۔

زیرِ نظر کتاب جناب واقفؔ کے متفرق مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ دراصل ابا مرحوم قاموسی ذہن رکھتے تھے۔ انہیں اس کا فن معلوم تھا کہ جس چیز سے وہ متاثر ہوں اسے اپنے طور پر نثر یا شعر کا پیکر عطا کر دیں۔ متعلقہ مضامین بھی ایسے ہی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان مضامین کی کیفیت کے بارے میں تقریب کے عنوان سے بزرگ محترم جناب پروفیسر وہاب اشرفی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان مضامین کی نوعیت اور اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ اس

لئے میں اپنی طرف سے اس ضمن میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا لیکن میں اسے محتویات اور موضوعات کے اعتبار سے بے حد قیمتی سرمایہ ضرور سمجھتا ہوں۔

ایک زمانہ میں ابا مرحوم خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے لئے مختلف موضوعات پر نثر پارے مسلسل لکھتے رہے تھے۔ وہ ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جو لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس ذخیرہ کو زیور طبع سے آراستہ ہونا چاہئے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ انہوں نے کتنے موضوعات پر کس انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ میں لائبریری کے اربابِ حل وعقد سے اس مسئلہ پر جلد ہی گفتگو بھی کروں گا۔ میں نے ابا جان کے ذہن کو قاموسی کہا ہے۔ ظاہر ہے میرے ذہن میں ان کی نگارشات ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی۔ جن میں کیفیت بھی ہے اور کمیت بھی۔ ایسے انسائیکلوپیڈیا کو عوام و خواص کے سامنے ضرور آنا چاہئے۔ میں اپنے طور پر اس سعی میں لگا ہوا ہوں، آگے اللہ مالک ہے۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ نثر پارے اور ابا مرحوم کی تمام تخلیقات وتنقیدات سامنے آئیں اور اردو کا دامن کئی جہتوں سے وسیع تر ہو۔

اکبر امام کاشف

۲- جون ۲۰۰۶ء

ہارون نگر-۲

پھلواری شریف، پٹنہ

ہمارا نصب العین اخلاقی جمہوریت

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جس وقت ''الہلال'' کے صفحات پر عضوی جمہوریت کے حسین چہرہ کی نقاب کشائی فرمارہے تھے کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد جمہوریت مرزا غالب کا حرفِ وفا بن کر رہ جائے گی۔

دہر میں حرفِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا

ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

عضوی جمہوریت سے مولانا ابوالکلام آزاد کی مراد یہ تھی کہ قوم ایک جسم ہے اور افرادِ قوم اس کے اعضاء و جوارح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی ایک حصہ جسم کی تکلیف سے اگر سارا جسم متاثر ہو تو عضوی جمہوریت ہے۔ جسم کے ہر حصہ کا کام علیحدہ اور ہر عضو کا وظیفۂ حیات جداگانہ ہے۔ جسم کے سارے اعضاء کا مرتبہ بھی یکساں نہیں۔ قلب کی حرکت بند ہوتے ہی زندگی رخصت ہوجاتی ہے۔ مگر کسی کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں تو لنگڑی ہی سہی مگر زندگی موجود رہتی ہے۔ مولانا آزاد مرحوم کی عضوی جمہوریت قوم کے ہر فرد کے دُکھ درد کو قوم کا فطری دکھ درد قرار دیتی ہے جس سے متاثر نہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ مگر ہر فرد کو اس کی طبعی اور ذہنی ساخت کے اعتبار سے الگ الگ فرائض اور علیحدہ علیحدہ اہمیت اور انفرادیت دیتی ہے۔ اس عضوی جمہوریت میں منوشاستر کے نظریۂ تقسیم فرائض کا وہ عیب موجود نہیں کہ شودر ''برہما'' کے پاؤں سے پیدا ہوئے، لہٰذا انہیں ہمیشہ نچلی سطح کی

غلامی پر اکتفا کرنی چاہئے۔ اگر وہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو ''برہما'' کے کھینچے ہوئے خطوطِ امتیاز کو مٹانے کا مجرم ہے۔ اس کو اس احمقانہ اپج کی عبرت ناک سزا ملنی چاہئے۔ موجودہ ہندو سماج کی ساری عمارت منوشاستر کے اسی مفروضہ اور من گھڑت کہانی پر مبنی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی عضوی جمہوریت اس نسلی برتری کے ظلم وفساد سے بالکل پاک ہے اور غور سے دیکھئے تو منوشاستر نے چار جداگانہ قومیتیں پیدا کیں۔ ایک جسمِ واحد کے مختلف اعضا کا تصور منو کے قانون میں ہرگز نہیں۔ جمہوریت اس کی نفی ہے اور عضوی جمہوریت انسانیت کے خدا کا وہ مذہب ہے جو منوشاستر سے بالکل علیحدہ اپنا مزاج رکھتا ہے۔

محترمہ سبھد را جوشی کے سیکولر ڈیموکریسی نے بطورِ خود سیدھی سادی بے آب ورنگ جمہوریت کے لئے جو کچھ کیا اس کی اہمیت سے انکار نہیں مگر بھارت میں اس کا مقابلہ جس اکثریت سے ہے منوشاستر کے اوراق سے پیدا ہوئی ہے۔ جمہوریت اس کے بس کا روگ نہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی عضوی جمہوریت تو اس مریض جاں بلب کی وہ دوا ہے جو حلق سے اُترتے ہی زہر کا کام کر جائے گی۔

درد ہے جاں کی طرح ہر رگ وپے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

انسان کے ذہنی تاریخ کے متعلم کے لئے یہ چیز بھی کافی دلچسپ ہے۔ جس وقت مولانا ابوالکلام آزاد آنے والے ہندوستان کو عضوی جمہوریت کا فلسفہ سمجھا رہے تھے ٹھیک انہیں ساعتوں میں علامہ اقبال مرحوم بحری جمہوریت کا الہامی پیغام صفحۂ قرطاس پر اس شدت سے انڈیل رہے تھے کہ انتہا پسندی کے ساحل سے حقائق کی موجیں سر پٹکنے کو مجبور تھیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے فرد اور ملّت کے باہمی رابطہ کو واضح کرتے ہوئے فرد کی نفی کر دی۔ فرد کی نفی بطور خود ایک سانحۂ عظیم ہے۔ مگر قابل تنقید نکتہ یہ ہے کہ علامہ

اقبال نے فرد کو جمہوریت کے دریا کا وہ مشہور قطرہ بنا دیا جس کی نشاندہی مرزا غالبؔ مرحوم نے کی تھی۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اسی نقطۂ نظر کو ذرا الفاظ بدل کر حسینانِ بھارت نے کہہ دیا تو ریاض خیر آبادی کی طرح مسلم اقلیت خفا ہو بیٹھی اور کچھ بتاتی بھی نہیں کہ آخر بات کیا ہے؟

ان حسینوں نے کہا کیا کہ خفا ہو بیٹھے

بات کیا تھی کہ ریاض آپ برا مان گئے

''راشٹریہ کرن'' قومی دھارا اور اس طرح کے دوسرے الفاظ سے مسلمانوں کو چڑ سی ہو گئی ہے مگر قصہ بحری جمہوریت کا ہے۔ راشٹریہ کرن تو اس کا ایک لازمی جز ہے۔ قومی دھارا سے ناراض ہونے کے بجائے بحری جمہوریت سے کنارہ کشی کیجئے اور اس عضوی جمہوریت کی طرف دو قدم تکلیف فرمائیے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے بھارت کے ہندو اور مسلمانوں کو عنایت کی تھی۔

عضوی جمہوریت کو تسلیم کئے بغیر اخلاقی جمہوریت کا کوئی مبہم تصوّر بھی ممکن نہیں۔ اخلاقی جمہوریت کا قیام ملک کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

منزلِ شوق طئے نہیں ہوتی

ٹھیکیاں ناتواں لیتے ہیں

عوامی فلاح و بہبود کی کوئی اسکیم بد دیانت، رشوت خور افسران کامیاب نہیں ہونے دیتے اور اس سے ماسوا یہ ہوشربا گرانی پٹا بھائی سیتا رامیہ کا سائنٹفک تحفہ ہے۔ اگر خلق خدا اس کو عذاب اور خدا کی جانب سے اس کے نیک بندوں کی آزمائش سمجھتی ہے تو غلطی کر رہی

ہے اور جس کو اپنی غلطی پر اصرار ہے تو اب یہ غلطی نہیں ہولناک جرم ہے۔

''پس چہ باید کرد''

غلّہ کی گرانی کو خدا کی نازل کی ہوئی مصیبت سمجھنے والا حکمراں اگر اینٹی کرپشن مہم سے پانچ منٹ بھی سوچنے سمجھنے کا وقت حاصل کر لے تو گرانی رفع ہو سکتی ہے۔ پٹا بھائی سیتا رامیہ کی لائی ہوئی ذہنی نحوست کے تاریک سائے غائب ہو سکتے ہیں۔ کسی ضلع کا غلّہ اس ضلع سے باہر نہ جانے پائے۔

صنعتی علاقوں مثلاً ٹاٹا نگر جمشید پور وغیرہ کی حکومت کی اندرونی و بیرونی امداد سے غذائی مسئلہ حل کرے۔ ہر ضلع میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔ ہر ضلع میں بڑے کارخانے قائم کئے جائیں جو اس علاقہ کے کھیت مزدور اور بے زمین افراد کے مسئلہ بیکاری و بیروزگاری کو موثر طور پر حل کر سکیں۔

ہر ضلع میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی طرز پر ترقی یافتہ ٹریننگ کالج قائم کئے جائیں۔ اگر عوام کی مرضی ہو تو ٹریننگ کالج عوام کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس کالج میں باہمی اتحاد اور اخوت خدمتِ خلق کی نظری اور عملی تعلیم کے وسائل مہیا کئے جائیں۔ منظم برائیوں کا مقابلہ منظم اچھائیوں سے کرنے کا گر سکھلایا جائے۔ ان تعلیم گاہوں میں فلسفۂ اخلاق کا یہ نکتہ ذہن نشین کر دیا جائے کہ اچھا اخلاق حکومت کے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بالعموم اور بہار کے ہر حصہ میں بالخصوص اخلاقی جمہوریت کا قیام اس کا نصب العین ہو۔

یک کاشکہ بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

پٹّا بھائی سیتا رامّیہ اور کانگریس

تاریخِ کانگریس کے مصنّف پٹا بھائی سیتا رامّیہ کو کون نہیں جانتا۔ تقسیم ہند سے پہلے ہی بزرگوار ایک کتاب لکھتے ہیں جس میں سرزمینِ ہندوستان میں کمیونزم کے فروغ پر بحث کرتے ہوئے دانشورانِ کانگریس کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ غلّہ کا نرخ اگر گراں کر دیا جائے تو کسان مالا مال ہو جائے گا اور کمیونزم کے مسافروں کو کسانوں کے چراغ میسّر نہ ہوں گے۔ کھیت مزدور ہر جگہ اقلیت میں ہوں گے۔ تھوڑی سی تمدّنی اور مذہبی اقلیتیں ہوں گی۔ اگر انہیں کمیونزم کی ہمنوائی اور ہوا خواہی کا جنون لاحق ہوا تو بہ نوکِ سنگین ان کے جذبۂ دل اور گرمیٔ قلب کا امتحان لیا جائے گا۔ سیاسی تحریک کی امتحانی ساعتوں میں عوام متحد ہوتے ہیں مگر اونچی سطح کی لیڈرشپ لالچ اور خوف کے دوگونہ عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔ حکمراں جماعت اگر ماؤف الدّماغ نہیں ہے تو عوام کو خوف کی تلوار سے دھمکیاں دیتی ہے اور لیڈروں کی گردن پر لالچ کی سنہری چھری پھیر دیتی ہے۔

آنجہانی پٹا بھائی سیتا رامّیہ کی صاف گوئی اور صاف دلی کا اعتراف کرنا چاہئے جنہوں نے ان تمام حالات اور امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہنا چاہئے تھا۔ آپ اور آپ کی انسانیت خوش ہو یا ناراض کمیونزم کے مقابلہ کے لئے سو فیصدی مصنوعی گرانی پیدا کرنے والی کانگریس ہے جس نے نہایت ایمانداری سے پٹا بھائی سیتا رامّیہ کے زرّیں مشوروں پر عمل پیرا ہو کر کمیونزم کے چھکے چھڑا دیئے اور بڑے بڑے

کمیونسٹ لیڈر کانگریس کے خفیہ تنخواہ دار اور کانگریس ہائی کمان کے اشارۂ چشم و ابرو پر انتخابی ڈرامے اسٹیج کرنے والے ایکٹر بن کر رہ گئے۔

مثالِ کشتیِ بے حس مطیع فرماں ہے
کہو تو بستۂ ساحل رہیں، کہو تو بہیں

کمیونسٹ پارٹی کے حصے بخرے ہوتے گئے اور دوسرے درجہ کے کامریڈ اس کو کارل مارکس کے جدلی مادّیت کا کرشمہ سمجھتے رہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا اپر چیمبر بین الاقوامی حالات کے دباؤ کا منظر درِ عیش دیتا رہا۔ غریب فاقہ مست اور سچ مچ مزدور قسم کا کامریڈ اپنے لیڈروں کی عیش پسندانہ سرگرمیِ حیات کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ جدلی مادّیت کی جنّت اسے بھی مل سکتی ہے، اگر وہ اسی طرح سڑکوں پر انقلاب زندہ باد، کمیونسٹ پارٹی زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا اعلیٰ درجے کا کمیونسٹ لیڈر ہو جائے۔

ایک بام و دو ہوا

یہ نہ سمجھئے کہ ایک ہی بالا خانہ پر حکومت دو مخالف سمتوں کی ہوائیں صرف کمیونسٹ پارٹی چلا رہی تھی۔ کانگریس اعلیٰ کمان بھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک بام و دو ہوا کی حکمت عملی پر کاربند تھا۔ ایک طرف کسان اکثریت کو غلّہ کی گرانی سے بے تحاشہ مالا مال کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف مزدور اقلیتوں کو سوشلسٹ پیٹرن والی سوسائٹی کے خیالی فردوس بریں میں داخلہ کا ٹکٹ مفت دیا جا رہا تھا۔ کانگریس کے ایماندار کارکن اپنے ایثار و قربانی کے اُلٹے نتائج دیکھ کر کانگریس ہائی کمان پر دبی زبان سے تنقید کرتے ہوئے گوشہ نشین ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی جگہ ابن الوقت خوشامدی دلال، خود غرض خوشامدی بے ایمان، بے سلیقہ اور بدنمائی کی حد تک بیہودہ افراد لیتے جا رہے تھے۔ کانگریس کی مشینری پر عملاً ان لوگوں کا قبضہ ہو چکا تھا جن کے نام پر شیطان بھی لاحول پڑھتا ہے۔

یہاں پر سلسلۂ سخن میں یہ تاریخی حادثہ بھی آپ کو یاد دلاتا چلوں کہ ہندوستان کی

آزادی کے اعلان کے بعد جس وقت انگریز سامراجیت سفید فام شہنشاہیت کے افسرانِ بالا دست اور آزادی کے نہتے رضا کاروں پر گولیوں کی بارش کرنے والی فوج اور پولس نے کانگریس ہائی کمان کو سلامی دی، اسی وقت نوکر شاہی کو وہ سب کچھ مل گیا جو اسے انگریزوں کے دورِ سلطنت میں بھی میسّر نہ تھا۔ اس خفیہ تبدیلی کو بہت کم محسوس کیا گیا جو کانگریس اعلیٰ کمان میں پیدا ہو چکی تھی۔ مگر کوئی سیاسی عمل نہیں جو دوررس نتائج نہ پیدا کردے۔ آپ نے دیکھا کہ بیوروکریسی کس طرح فرزندِ دلبند دولتِ بھارت بن گئی۔ آپ نے دیکھا شمعِ آزادی کے پروانوں کی خاک بھی فضا میں منتشر کردی گئی۔

ہے ہوا کے دوش پر خاکسترِ پروانہ آج
جھلملاتے ہیں چراغِ کعبہ و بتخانہ آج

بیوروکریسی جب جمہوریت کے پیشِ نظر مسلّط کردی جائے تو کانگریس کی اخلاقی ساکھ کیوں کر قائم رہے۔ لیکن اخلاقی جمہوریت میں توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہندو پانی اور مسلمان پانی کی طرح ہندو اخلاق اور مسلم اخلاق کی بحث چھڑ گئی تو اس کی پیچیدگی کو کون سلجھائے گا؟ جواباً گذارش ہے انسانیت کی طرح اخلاق بھی قابلِ تقسیم شئے ہے۔

حقیقت ایک ہے دونوں کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دِل چیریں

ممکن ہے آپ کا ذہن اخلاقی جمہوریت کے واقعات طلب کر رہا ہو مگر جب تک اصولاً آپ اس کو تسلیم نہ کریں خواص اہل الرائے، اربابِ فکر و بصیرت کی رائے عامہ ہموار نہ ہو جائے، اخلاقی جمہوریت کی دفعات پر گفتگو یاوہ گوئی ہے، اور یاوہ گوئی وہ خطرناک بیماری ہے جس سے مولانا مودودی بھی کسی زمانہ میں خدا کی پناہ طلب کرتے رہتے تھے۔

موجودہ دور کا نوجوان جن مشکلات کا شکار ہے وہ تمام تر معاشی ہیں لیکن اس کی معاشی زبوں حالی اور ابتری کا راز اس بد اخلاقی میں پوشیدہ ہے جو اس کے سر پر بلائے مہیب بن کر مسلط ہے۔

اس ادا سے کہ فرستادۂ گردوں سمجھوں
گھر مرا پوچھتی اوپر سے بلائیں آئیں

تعلیم کا مقصد جب تک بہتر جسمانی، بہتر دماغی استعداد کی نشو ونما کے ساتھ بہترین اخلاقی تربیت کا امتزاج رہا۔ دامنِ صحرا پھولوں سے بھرا نظر آتا تھا۔ پھول تو پھول، خیر سے کانٹے بھی گلوں سے بہتر نظر آتے تھے جو کم از کم دامن تو تھام لیتے تھے۔ مگر آج کیا حال ہے بڑے بڑے گلشن پرست بھی کانٹوں سے نباہ کئے جا رہے ہیں۔ ہماری درسگاہوں میں ''مِٹل'' کی ''انڈی ویجول ازم'' ہی نہیں پڑھائی گئی بلکہ ہر نوجوان کو نطشے کی سپر مین بننے کی عملی مشق بھی کرائی جانے لگی۔ انڈی ویجول ازم اخلاقی پابندیوں سے آزاد رہ کر شخصی زندگی بسر کرنے کا پہلا سبق تھا جو ہمارے بچوں کو دیا گیا۔ اس کے جارحانہ انفرادیت کا زینہ تھا جو نطشے نے مہیا کر دیا۔

بے خودی کا یہ تقاضا کہ خدا بن جاؤں
بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

موجودہ نظامِ تعلیم میں مقصدی انقلاب برپا کرنا ہمارا فرض ہے۔ تعلیم برائے تعمیر اخلاق یا تہذیبِ اخلاق کے نظریہ کے بغیر ہماری درسگاہیں معاشی بہائم پیدا کرتی رہیں گی۔ اشاعت میں نظامِ تعلیم اور فلسفہ تنازع للبقا کی تباہ کاریوں کے خلاف بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ مگر اس نے پورے ملک کی موجودہ نسل کو جس مہم کے دروازہ پر لا کھڑا کیا ہے اس سے چشم پوشی گناہِ عظیم ہے۔

اخلاقی جمہوریت نجات کا واحد راستہ

عشق ہے سعی مری، عشق ہے حاصل میرا
یہی منزل ہے، یہی جادۂ منزل میرا

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آ گیا تو اسے بھولا نہیں کہیے۔ بے بنیاد جمہوریت کے تلخ تجربات نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اخلاقی جمہوریت کے قیام کو ہی اپنی فرصت اوّلیں کا فریضۂ عمل قرار دیں۔

دولت بہ غلط بنود از سعیٔ پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

میں نے گذشتہ اوراق میں اخلاقی جمہوریت کا سرسری اور اجمالی تعارف کراتے ہوئے بے بنیاد یا بے آب و رنگ جمہوریت پر رعایتِ لفظی و معنوی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا عریاں ہونا

آزادیٔ ہند کی تاریخ اب ایک صدی کی چوتھائی پر قابض ہو چکی ہے۔ دہلی کی مرکزیت ہو یا بہار کی صوبائیت اور ریاستیت انگریزوں کے منفی قوانین کے فرسودہ اوراق کو شہد لگا کر چاٹ رہی ہے۔ انگریز شہنشاہیت نے تعزیراتِ ہند مرتب کی اور حق یہ ہے کہ دنیائے قانون سازی میں تعزیراتِ ہند کا علمی اور فنی مرتبہ جرم و سزا کی قدیم سیاسی تعریف

کے مطابق جامعیت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے بہت بلند ہے مگر علم قانون اور علم سیاست کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ شہنشاہیت کا تصورِ حکومت چند انتظامی امور اور عوام کی باہمی حق تلفیوں کے متعلق ایک تعزیری طاقت کی حد تک محدود تھا۔

اس وقت حکومت ایک منفی طاقت تھی اور اس کے پاس منفی قوانین کے سوا دوسرا سرمایہ موجود نہ تھا۔ بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ تنازع للبقا کا شیطانی نظریۂ حیات بھی اپنی ساری تباہ کاریوں کے ساتھ مصروفِ عمل ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بے انتہا مظالم ڈھائے مگر اس نظریہ تنازع للبقا کو اسکولوں، کالجوں اور علمی کتابوں کے ذریعہ گھر گھر پھیلا دینا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کا احساس چیخ اُٹھا۔

یوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

غلط تعلیم نے دلوں کی بستی اُجاڑ کر رکھ دی۔ انسان کے بچے درندے، بہائم، بھیڑیئے اور چھوٹی مچھلیوں کو نگل جانے والی بڑی مچھلی بن کر نادر چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ کرنے لگے۔ اپنے مفسدانہ طرزِ عمل کے لئے ان کے پاس تنازع للبقا کا فارمولا موجود تھا، جس پر فلسفیانہ طرز کی انگریزی مہریں ثبت تھیں۔ اب کمزوروں کے لئے چرخِ نیلی فام کے نیچے پناہ کی کوئی جگہ نہ تھی کیوں کہ وہ چھوٹی مچھلی تھی اور چھوٹی مچھلی ہونا بجائے خود وہ جرم ہے جس کی سزا بڑی مچھلی اس کو نگل کر یقیناً دے گی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

موزوں قانون کی عدم موجودگی نے کمزوروں کو بے پناہ کیا تھا۔ تنازع للبقا نے وہ معاشرہ تیار کیا، وہ سماج بنایا، وہ سوسائٹی ترتیب دی جس نے کمزوروں کو ہضم کر لینا اپنا پیدائشی حق سمجھا اور اس تمام ظالمانہ اور انسانیت سوز اعمال کو عین فطرت کا حکم قرار دیا۔

مذہب اور یہی مذہب اس کے خلاف آواز کیا بلند کرتے۔ بہت دنوں تک تو بات ان کی سمجھ میں ہی نہ آئی اور جب آئی تو خود وہ اس کا شکار ہو چکے تھے۔ جو لوگ اذانِ بتکدہ بنتے اب کفر از کعبہ بن چکے ہیں۔ علم، دولت، عقل، اثر و رسوخ، جسمانی طاقت، جماعتی قوت اور اعلانیہ پس پردہ اور بے نقاب جب جاہلوں، غریبوں، سادہ لوح بے اثر و بے رسوخ جسمانی طور پر کمزور اور جماعتی اعتبار سے پست و پراگندہ لوگوں کو اپنا لقمہ تر سمجھنے لگے تو سوا نیزہ پر آفتاب کیوں نہ آتا۔ قیامت کیوں نہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ اس کو کمیونسٹوں کی جدلی مادیت کا ثبوت نہ سمجھئے، صرف تنازع للبقا کو فلسفۂ حیات بنا کر چلنے کی لعنت ہے، شامتِ اعمال باصورتِ دیگر گرفت۔

فطرت کا انتقام ہے نفرت کی زندگی
چاروں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

مرحوم جگر مراد آبادی میرا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ لکھنے کے بعد علم و عمل کے فساد کو دیکھ کر بے اختیار چیخ اٹھے۔

جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں
فسطائیت حقیقتِ عریاں ہے آج کل

ہے زخمِ کائنات جو ہے بند ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

عوام ہوشیار اور خواص تیار

حکومت اور عوام کی ہاتھا پائی بہار کے طول و عرض اور بالخصوص پٹنہ کی زندگی کا معمول بن چکی ہے۔ مسلم اقلیت کے مفکرین، بہار کے رہنما اور اخبارات کی ڈری سہمی چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ ایک مقامی ہفتہ وار نے اپنے مستقل کالمسٹ کے قلم سے جو معزز پرفیسر بھی ہیں اور جماعت اسلامی کے نظریات و خیالات کے پس پردہ علمبردار بھی۔ موجودہ کانگریسی وزارت بہار کے درباری بھی ہیں اور مسلم فرقہ پرستی کے نشانِ راہ بھی۔ ایک کالمی، دو کالمی بدحواسی چھاپی ہے جس میں طویل ردّ و کد کے بعد یہ چند باتیں عوام کو باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱. مقصد اگر صحیح ہو تو طریقِ کار بھی صحیح ہونا چاہئے۔ یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔
۲. تشدّد کے معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر چوری چورا میں مہاتما گاندھی نے واپسی کا بگل بجا دیا تھا۔
۳. عوام کا اکسپلائٹیشن کیا جا رہا ہے۔
۴. جن سنگھ اور آر ایس ایس کے ہاتھ میں موجودہ عوامی تحریک کی قیادت ہے۔ بچی کھچی قیادت پر اشترا کی ذہن اور کمیونسٹ پارٹی کا قبضہ ہے۔
۵. تحریک کا رخ فرقہ پرستانہ ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذ عوام ہوشیار اور خواص تیار رہیں۔

فرمائیے اب آپ کو کیا کرنا چاہئے؟ اگر آپ عوام ہیں تو آپ کو ہوشیار رہنا چاہئے

اور خدا نے اگر آپ کو خواص کا مرتبہ عطا کیا ہے۔ وہیں جانی پہچانی ہندو مسلم صف آرائی کے خطرہ سے آپ کو کس چیز کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اپنے تحفظ کے لئے یا دفاعی جنگ کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ان حضرات سے کون پوچھے کہ دہلی، پٹنہ کی مقدس اور متقی قیادت عالیہ صرف حکومتِ الٰہیہ کے لٹریچر اور جمعہ کے خطبات میں قربِ قیامت کی نشانیوں پر اکتفا کرتی رہیں گی یا بھوک، نفع اندوزی، افکار و اکتناز، رشوت ستانی، کنبہ پروری کے متعلق عوام کی صحیح عملی رہنمائی کا فرض بھی انجام دے گی۔

یہ سارا ہنگامہ کانگریس کی اندرونی خرابیوں، حکام کی غفلت اور غیر ذمہ دارانہ روشی کا آوردہ ہے۔ کمیونسٹ قیادت ہو یا جن سنگھی قیادت، جے پرکاش نارائن ہوں یا کرپوری ٹھاکر، میدانِ عمل میں اپنا رول کرنا جانتے ہیں اور مقامی ہفتہ وار کے مفکر کالمسٹ صرف ڈراتے رہنے، خطرہ محسوس کراتے رہنے اور اپنے کلبۂ احزان میں بیٹھ کر درد کی لوری گانے کا فن جانتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی مرحوم کا غیر فانی شاہکار ہے:

یہ بزمِ مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مگر اس کے لئے جرأت رندانہ کی ضرورت ہے جس کی اہمیت مقدسینِ جماعت اسلامی نے کبھی محسوس نہیں کی۔ نتیجہ وہی اندازِ فکر ہے جو موصوف کے حصہ میں آیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو سلام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ایک عرصہ کے بعد السلام علیکم بھیجا ہے۔ قبول فرمائیے اور وعلیکم السلام کہئے۔ یہ سلام انٹرویو دیتے ہوئے بھیجا گیا ہے۔ مولانا مودودی کی کتاب سیاسی ''کشمکش'' کی جو قیمت ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی اس کا تذکرہ لا حاصل ہے۔ غنیمت ہے کہ انہیں ہم یاد تو آئے۔

زباں پہ شکوۂ ایام آ ہی جاتا ہے
کچھ اس طرح بھی ترا نام آ ہی جاتا ہے
نسیم کے نہ سہی بجلیوں کے ہاتھوں سے
کبھی کبھی کوئی پیغام آ ہی جاتا ہے

خیر سلام کے بعد اب مولانا مودودی کا کلام سنئے۔ پوچھا گیا کہ جماعت اسلامی کے اراکین کی تعداد کیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ تین ہزار اراکین اور سات لاکھ ''رجسٹرڈ متفقین'' ان رجسٹرڈ متفقین کی تعداد تو خدا ہی کو معلوم ہے۔ ڈکٹیٹر شپ اور گروپ ڈکٹیٹر شپ جب تنظیم کے میدان میں لنگوٹا باندھ کر اُترتی ہے تو اس طرح کم سے کم تعداد اصلی اور حقیقی ممبر بناتی ہے۔ اس طرح درج رجسٹر متفقین کی بڑی سے بڑی تعداد مہیا کرتی ہے جن کا کام فاسمعو واطیعو سنو اور اطاعت کرو کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی تین ہزار ممبر سات لاکھ درج رجسٹرڈ

محققین اور اَن گنت رجسٹرڈ ہمنواؤں کی تعداد کیا تھی؟ یا ساریہ الجبل کہنے والے امیرالمومنین حضرات فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو برسرِ منبر عبا کے طول وعرض کے مسئلہ پر ٹوک دیا جاتا ہے۔ اورانہیں اپنا تشفی بخش بیان صفائی دینے تک خطبۂ جمعہ کوملتوی رکھنا پڑتا ہے۔ کہاں وہ حریت فکراور آزادی تقریر اور کہاں یہ ذہنی غلامی۔ اوّل بہ آخر نسبتے دارد۔ فنا للعجب دراصل یہ کمیونسٹوں کا طریقۂ تنظیم ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے کمیونسٹوں سے بہت کامیاب تحریری اور تنظیمی مقابلہ کیا۔ مسلم نوجوانوں کی ہوا کا رُخ پھیر دیا۔ کمیونسٹوں سے مقابلہ کے لئے بہترین لٹریچر مہیا کر دیا۔ مگر اپنی تنظیم صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے طریق عمل پر نہیں بلکہ اسٹالن کے اصولِ جماعت سازی پر کر ڈالی۔ انہیں آج تک یاد نہ آیا کہ "سبیل المومنین"، یعنی مومنین اولین صحابہ کرام کے طرزِ عمل اور طریق کار سے سرمو انحراف بھی گمراہی ہے۔ بہت پرانی فارسی کہاوت ہے:

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تاثر آیا می رود دیوار کج

پہلی اینٹ اگر معمار نے کج رکھ دی تو آسمان کی بلندیوں تک دیوار کج ہی رہے گی۔ دور کیوں جائیے اپنی ریلوے کو ہی لیجئے جو بار بار چکا بند ہڑتال کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ حکومت سے مطالبہ ہے کہ تین سو کروڑ روپے ریلوے کو فوراً دے دو ورنہ ریلوے کے پہیے فوراً رک جائیں گے۔ جواباً جارج فرنانڈیز اور ان کی حکومت نے کیا کہا فی الحال اس کو جانے دیجئے۔ فی الحال توجہ ریلوے یونین کی محدود تنظیم کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ انہیں اپنا اور اپنے گروہ کا مفاد۔ سارا ملک، سارے ملک کے غریب عوام کی زیادہ تعداد جو بھوکی ہے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے سنا تھا۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ مگر یہاں چھوٹی مچھلی کی ایک بڑی تعداد بڑی مچھلی پر حملہ کرنا چاہتی ہے۔ تجزیہ کی کسوٹی نے پرکھ کے بعد جماعتی خودغرضی پر مبنی جماعتوں کو ناقص اور ناقابل استعمال کہہ دیا۔ حکومت سوچے یا نہ سوچے مگر آپ سوچئے۔

یہ ریڈیو پاکستان ہے مطلع ملاحظہ فرمائیے

ریڈیو پاکستان سے ریڈیو مشاعرہ کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ راقم الحروف قلم بکف ہمہ تن گوش تھا۔ پاکستانی شاعر صاحب مطلع عنایت فرمارہے تھے۔

اک جام دو کہ تشنہ دہن بولنے لگے
سورج ڈھلے تو سرخ کرن بولنے لگے

پڑھنے کا انداز باوقار تحت اللفظ کا حامل بس ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آغا ناظم کے امام باڑہ میں میر انیس، میرزا دبیر کی روحیں بالمقابل بول رہی ہیں۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے

غزل میں مرثیہ اور مرثیہ میں غزل کا جو تجربہ میرزا یاس یگانہ چنگیزی نے شروع کیا تھا اور مرحوم بھائی عبدالمجید سالک لکھنوی ایڈیٹر ''انقلاب'' لاہور کی افکارِ حوادث والی شرارتوں سے سخت برہم ہو کر تقریباً ناکام ہو گیا تھا۔ پاکستانی شاعر کے ریڈیو مطلع سے پھر افق پر نمودار ہو گیا۔ اب رہی یہ بات کہ دونوں مصرعے ذولخت ہیں۔ دونوں میں تعلقِ مضمون پیدا نہیں ہو سکا۔ پرانی باتیں ہیں۔ اب غزل کی نئی قدریں پاکستان میں پیدا ہو رہی ہیں۔ اب وہاں اک جام دیا جائے گا اور تشنہ دہن بولنے لگے گا۔ پھر اسی وقت یا اس کے چند گھنٹے بعد سورج ڈھلے گا۔ اس کو ڈھلنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ ظاہر ہے

کہ سورج کے ڈھلتے ہی سرخ کرن بولنے لگے گی۔ استاد فوق بلگرامی نے یہ کہا تھا کہ:

خم سے جامِ شراب نکلا
کہسار سے آفتاب نکلا

وہیں استاد داغ دہلوی مرحوم فرماتے ہیں:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غور فرمائیے، پاکستان کے "ریڈیائی شاعر" نے رات کے وقت ریڈیو سے غزل سنائی مگر مطلع کہا صبح کے آٹھ نو بجے یا بارہ بجنے سے سات آٹھ منٹ پہلے۔ اتنی زبردست ٹائمنگ استاد داغ کو کہاں نصیب تھی۔

پھر سورج ڈھلنے کے بعد سرخ کرن واہ واہ، سبحان اللہ کتنا کمیونسٹ اور ماوزی تنگ ٹائپ کی انقلابی روح ہے۔ اس مطلع کے قالب مردہ میں ایک جام دو کہہ کر کس طرح عرب ممالک سے امداد طلب کی گئی ہے۔ کس کس نکتہ کی داد دی جائے۔ یہ مطلع نہیں چین پاکستان کی دوستی کا انقلابی رمز یہ ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

شوکت تھانوی مرحوم کے انڈر گراؤنڈ ہونے کے بعد پاکستان ریڈیو علی گڑھ والوں کی زبان میں خاص چیز بن کر رہ گیا ہے۔ خدا اس کو ساری مضحکہ خیز ادبی حرکتوں کے ساتھ خوش رکھے۔ اے دقت کہ تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

مولانا عثمان فارقلیط کی ''فوجی سطح'' اور امام غزالی

کل پرسوں مولانا عثمان فارقلیط نے مسلمانانِ ہند کے لئے چند تعمیری تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کی افادیت میں جو کہ شک آرد ''لغو و مہمل گردد''۔ ضرورت ہے کہ سارے ملک میں فارقلیط کمیٹی بنادی جائے اور محترم فارقلیط کے دیئے نقوش و افکار پر مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی فلاح و اصلاح ترقی و استحکام کا کام شروع کردیا جائے۔

مگر ایک بات بہت خطرناک نظر آئی۔ فارقلیط صاحب مسلمانوں کے شادی بیاہ کے بیہودہ اور تباہ کن رسم و رواج کی اصلاح فوجی سطح پر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لفظ انہیں کا ہے۔ راقم الحروف کا تصرف اور اختراع نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فوجی سطح سے کیا مراد ہے۔ وہی صورت حال پیدا کردیتا جس سے آج کل بہار اور پٹنہ عظیم آباد میں ہم لوگ دوچار ہیں۔ نوجوان طلباء اور قوم کی اصلاح کا نیک جذبہ رکھنے والے پیدائشی غنڈے صاحب ایک پارٹی فارم پر جمع ہوکر سوچیں گے تو آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر طرف ڈائریکٹ ایکشن کی بہار آجائے گی۔ ہر طرف فارقلیط ہمارا زندہ باد کا نعرہ بلند ہوگا۔ بیچارے بیہودہ رسم و رواج والوں کے ہزاروں اٹھالے جائیں گے۔ گلے میں ''جوتوں کا ہار'' اگر ممکن نہ ہوا تو سائیکل کا ہار ڈال کر ان کی پٹیوں، گھونسوں اور طمانچوں کی بارش میں ہزاروں غیر ذمہ دار تماشائیوں کے ساتھ بازار کی سڑکوں سے پیادہ تھانہ تک پہنچا دیا جائے گا۔

پولیس اور داروغہ اسی طرح بے بس ہوں گے جس طرح آج کل یہاں نظر آرہے

ہیں۔مولانا فارقلیط نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کوعوامی آندولن بنادینے کا جوارادہ کیا ہے حضرت امام غزالی نے اپنی کتابوں میں اس سے اختلاف کیا ہے۔امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو خدا را خواص تک محدود رہنے دیں۔عوام ہمیشہ انتہاپسند ہوتے ہیں اور انتہاپسندی تشدد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔''شیعہ سنی فساد''،''وہابی حنفی فساد''،''بریلوی دیوبندی فساد'' کے بعد مولانا فارقلیط کی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تحریک تو بالکل ظہر الفساد فی البر والبحر کا منظر پیش کردے گی۔

سیکولر غالب، سیکولر مومن اور سیکولر شاعری

ایک مقامی روزنامہ کے فاضل مضمون نگار نے یہ دلچسپ بات بتائی ہے کہ غالبؔ کی صد سالہ تقریبات میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ غالب مرحوم سیکولر تھے۔

نا معلوم لکھنے والوں اور بولنے والوں نے غالب کے سیکولر ہونے کے کیا کیا دلائل دیئے تھے۔ اگر غالب یہ کہتے ہیں:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

یہ شعر بھی فرماتے ہیں جو نہایت خطرناک قسم کا سیکولر پروپیگنڈہ ہے:

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافرانِ اصنامِ خیالی نے مجھے

سب سے زیادہ سیکولر تو مومن خاں مرحوم ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مگر لاحول ولاقوۃ یہاں بھی اینٹی سیکولر تحریک وہی ہے۔

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

سیکولر اردو شاعری پر اگر اردو کے کوئی پروفیسر طبع آرائی فرمانا چاہیں تو اردو شاعری اور سیکولرازم دونوں کو نقصان پہنچے گا۔ تنگ نظری فنونِ لطیفہ کی دشمن ہے۔ شاعر جس مذہب کا ہو وسیع المشرب ہوتا ہے۔ لامذہب اور مخالف مذہب نہیں ہوتا۔ سیکولرازم جدید مادّی دنیا کی سیاسی اصطلاح ہے اور اپنے آپ میں منفی مزاج رکھتی ہے۔ وہ کسی مذہب کی طرفدار اور ترجمان نہیں۔ مگر شاعری اور بالخصوص اردو شاعری اپنا مثبت کردار اور اپنا ایجابی مزاج رکھتی ہے، سیکولرازم سے مختلف بھی اور بلند بھی۔

امیر جاتے ہو بتخانہ کی زیارت کو
ملے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا

(امیر مینائی)

اردو شاعری کے دیوانے کو قیدِ مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔

مدعا مسجد سے کیا مقصود بتخانے سے کیا
قیدِ مذہب کو علاقہ تیرے دیوانے سے کیا

وہ سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں رکھتی ہے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

وہ تقسیم کار کے اصولوں پر سیاستدانوں کے فرائض میں دخل اندازی نہیں کرتی۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

وہ آزاد بھارت سیکولر بھارت کے چپّہ چپّہ سے اپنی محبت آفریں وحدت کی بنیاد پر ہم کلام ہے:

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر
(جگر مرادآبادی)

اردو شاعری گلشن پرست ہے۔ یہ پھولوں ہی سے محبت نہیں کانٹوں سے بھی نباہ کرنا جانتی ہے۔

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
(جگر مرادآبادی)

اردو شاعری فساد پسند ہندو اور مسلمان دونوں کے متعلق صاف اعلان کرتی ہے کہ:

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

اردو شاعری سیکولر بھارت کی وقتی اور ہنگامی شورشوں سے مایوس نہیں ہے۔ اسے اپنی شبنم افشانی پر ناز ہے۔

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بلبلوں کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

اردو شاعری کو سیکولر کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی جج صاحب کو داروغہ جی کہہ دیا جائے۔

ہوئے تم دوست جس کے

انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ کی بالائی منزل پر ۲۱ مئی ۱۹۷۴ء کو شام پانچ بجے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کا ماتمی جلسہ کر بیٹھی۔ وہ ٹولی جو جسٹس خلیل کی ٹولی کے نام سے پٹنہ کے کوچہ و بازار میں مسلم عوام کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد تنقیدوں کا نشانہ بنتی چلی آ رہی ہے۔

مجمع جمہوری نوعیت کا تھا کیوں کہ بقول اقبال جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے، اس لئے مجھ سے حاضرین کی تعداد نہ پوچھئے۔ مسلمان اقلیت ہیں اور اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت۔ ڈاکٹر فریدی مرحوم اس اقلیت کے لیڈر تھے اور سب سے بڑے لیڈر۔ یہ ماتمی جلسہ قلیل ترین حاضرین کا اجتماع تھا اور سب سے بڑا اجتماع۔ ممکن ہے داعیانِ جلسہ نے سوچا ہو کہ تعداد کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اقلیت اور اکثریت جمہوری دور کی بدعتیں ہیں۔ خدا جب چاہتا ہے فتنۂ قلیل کو فتنۂ کثیر پر غالب کر دیتا ہے۔ چھوٹے گروہ سے بڑا گروہ مغلوب ہو جاتا ہے۔ بلاخوفِ تردید یہ مختصر ترین مجمع ماتم وزن کے اعتبار سے اتنا عظیم الشان تھا۔ اس مجمع ماتم کا کیا کہنا جہاں مسٹر سنیل چٹرجی سوشلسٹ لیڈر بھی ہوں اور بھائی تقی رحیم کمیونسٹ لیڈر مست قلندر بھی۔ جہاں حبیبیہ ہوٹل کے مالک خاکسارانِ جہاں رانجھات منگر کا خالص مشرقی فلسفۂ حیات خلیل احمد کو سمجھا رہے ہوں۔ جہاں کم سے کم تعداد میں چھپنے والے نصف درجن اخبارات

کے ایڈیٹرانِ تشنہ کام جسٹس خلیل احمد کے اشارۂ چشم و ابرو کے منتظر کمر بستہ خدمت و عمل ہوں، مولانا نظام الدین ناظم امارت شرعیہ نے قدم رنجہ فرمایا ہو، جہاں ہر شخص کی نگاہیں جسٹس خلیل کا چہرہ دیکھ کر جناب غلام سرور کا جائزہ لے رہی ہوں، جنہوں نے ''سنگم'' کے ایڈیٹوریل شامِ اودھ میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کو تہہِ دل سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انتہائی شرافت و دیانت کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ وہ.......... ہیں۔اس جلسہ کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کرنا جناب سلیمان سیٹھ ایم پی کے علاوہ جمہوری دنیا کا کوئی باشندہ پسند نہیں کرسکتا۔آپ کو جلسہ کے وزن کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔اب بوجھل تقریروں کا بارِ گراں بھی اپنے دلِ ناتواں پر اُٹھا کر رکھ لیجئے کیوں کہ محبت میں کبھی اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے۔

ہر مقرر اپنی تقریر میں ساری باتیں کہنے کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر فریدی پر چیز یبل نہیں تھے۔انہیں کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا تھا۔نیتوں کا حال تو عالم الغیب جانے مگر ظاہر بہ ظاہر اس کی زد سامنے بیٹھے ہوئے جسٹس خلیل پر پڑ رہی تھی کہ مزہ آ رہا تھا۔ہر مقرر کا لب ولہجہ بتا رہا تھا کہ آج کے ''سنگم'' کا اداریہ شامِ اودھ اس نے بہت غور سے پڑھا ہے اور جسٹس خلیل کے متعلق مرحوم ڈاکٹر فریدی کے آخری کلمات خیر دل کی پھانس بن چکے ہیں۔

غلام سرور صاحب بھی بولے اور قبر کی ہولناکی میں مرحوم ڈاکٹر فریدی کے لئے ربّ کریم سے تخفیف کی التجا کی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

پروفیسر عبدالمغنی نے خداوند کریم سے مرحوم فریدی کے سیاسی گناہوں کی پر پیچ معافی تلافی کرڈالی اور بزعم خود غلام سرور کے نہلے پر دہلا رکھ دیا۔

ہا! حضرت مسیح علیہ السلام نے کیا دعاء فرمائی تھی، خداوندا مجھے میرے دوستوں سے

بچا۔ طبیعت مکدر ہو چکی تھی کہ بحکم صدر جلسہ بھائی تقی رحیم ماتمی تقریر کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مست قلندرانہ تقریر سے مجلس ماتم کو زعفران زار بنا کر رکھ دیا۔ ہر شخص ہنس رہا تھا اور تقریر کی آندھی چل رہی تھی۔ ٹیپ کا بند تھا کہ فریدی مر گئے اور ملت اسلامیہ کے مسائل باقی ہیں۔ تم سب لوگ مر جاؤ گے، ہم سب مر جائیں گے۔ ملت اسلامیہ باقی رہے گی، اس کی الجھنیں باقی رہیں گی۔ شمع ہر رنگ میں روتی ہے، سحر ہونے تک۔ اگر تم حل کر سکتے ہو تو بتاؤ کس طرح حل ہوں گے مسائل؟ وغیرہ من الخرافات۔

یہ تھا وہ جلسۂ ماتم جو ۲۱ مئی ۱۹۷۴ء کی شام انجمن اسلامیہ ہال کی بالائی منزل پر منعقد ہوا۔ یہ تھی کنڈولنس میٹنگ جس کا آنکھوں دیکھا حال آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ہاں مسٹر جسٹس خلیل صدر جلسہ کی تقریر شستہ شائستہ بہت شاندار فصیح و بلیغ دستوری اور پارلیمنٹری تھی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ مگر مغرب کی اذان ہو گئی۔

موذن غلط گفت بانگِ نماز
مگر ہمچو من مست و مدہوش بود

چیچک اور مسدسِ حالی اور اس کی گالی

اردو رپورٹر ۲۱ مئی (بمبئی) کے مضمون نگار ابراہیم جونیئر کالج محبوب نگر نے جس حسن ترتیب کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ آج سے ڈیڑھ دو سو سال قبل چیچک یورپ کی مہلک بیماری تھی۔ چین میں چھٹی صدی عیسوی میں ایک حکیم نے اس مرض سے بچنے کا یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جو لوگ چیچک سے صحت یاب ہو جاتے تھے ان کے کپڑے اُتار کر ان کے بچوں کے گلے میں ڈال دیئے جاتے تھے۔ چیچک کا مرض اُن پر کبھی حملہ نہیں کرے گا۔ چین کا یہ نظریۂ علاج پھیلا تو یورپ نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ چیچک کے مریض کے دانوں اور چھالوں کا پانی سوئی کے ذریعہ تندرست آدمی کے جسم میں داخل کیا۔

ڈاکٹر ''جیز'' نے ۱۷۹۸ء میں ٹیکہ ایجاد کیا۔ اس نے اپنے حفاظتی طریقۂ علاج پر پمفلٹ شائع کر کے یورپ کے ہر ملک میں پھیلا دیا۔ سارا یورپ اس کا معتقد ہو گیا۔ انگلستان کے بادشاہ نے اس پر انعامات کی بارش کر دی۔ سن لیا آپ نے؟ اس طرح مشرقی جہالت اور مشرقی جہالت کی قیاس آرائیوں پر یورپ کا تجربہ اندھے کی لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ اس وقت سر سید مرحوم کی وہ گالیاں خدا کو معلوم کیوں یاد آ رہی ہے جو مسدس حالی کی زبان میں خواجہ حالی مرحوم کے قلم فصاحت رقم نے ان لوگوں کو دی گئی تھیں۔ جو طب یونانی کے معتقد اور شیخ الرئیس حکیم بوعلی سینا کی تصنیفات کے خوشہ چیں تھے۔

سلف لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے
صحیفے میں اُترے ہوئے آسماں سے

اتنا ہی نہیں ہندوستان کے ماہرین طب یونانی سرسید گروپ کی نگاہوں میں کتنے مضحکہ خیز اور خطرناک تھے۔

نہ پانی کا علم اور نہ علم ہوا ہے
مریضوں کا اِن کے نگہبان خدا ہے

اس پروپیگنڈہ کا جواب موثر شکل میں حکیم اجمل خاں مرحوم اور شفاءِ الملک حکیم عبدالمجید خاں لکھنوی نے مہیا کر دیا۔ جن کے قدموں پر ڈاکٹر طرزِ علاج کو اس کے انگریز اور ہندوستانی ماہرین کو حیرت و استعجاب سے سر عقیدت جھکائے ہوئے دیکھنے والوں نے دیکھا ہے۔ مگر مسدس حالی کے پروپیگنڈہ کے زیر اثر طب یونانی کے سرکار زائدہ اور دربار پروردہ کالجوں سے جو اطباء اور علماء آج پیدا ہو رہے ہیں بالکل سلفا ڈائزین اور شربتِ دینار انگیختہ ہیں۔ حکمت شیخ الرئیس بوعلی سینا اس دورِ حکومت پناہی میں کوفہ بیختہ مالیدہ صاف نمودہ تھی۔

افسوس اب جھوائی ٹولہ لکھنو کی گلیوں سے بھی جواہر مہرہ پارِ خانہ سازِ اوّل بخواند عقب آں کی جاں بخش آواز نہیں آتی۔

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسّم ہوئی بہار ہوئی

جماعت اسلامی اور شیخ عبداللہ

یہ خبر اس روزنامہ نے شائع کی ہے جس نے ایڈیٹرس کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں مولانا محمد مسلم صاحب ایڈیٹر ''دعوت'' دہلی کی خفیہ ملاقات کا بندوبست کیدار پانڈے سے کیا تھا جو اس زمانہ میں چیف منسٹر بہار تھے۔ مقامی روزنامہ کے مدیر محترم نے اپنی چار کالمی سرخی کا جھنڈا اگاڑتے ہوئے ناظرین کو بتایا ہے کہ دہلی میں شیخ عبداللہ اور جماعت اسلامی ایک جان دو قالب ہیں اور کشمیر میں انتہائی خوفناک جنگ لڑ رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی یہی وہ ادائیں ہیں جن پر کبھی قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ پاکستان میں اس کی روش کچھ اور ہندوستان میں کچھ اور، دہلی میں کچھ اور کشمیر میں کچھ اور۔۔

جماعت اسلامی ہر زمین پر نیا آسمان دیکھنا چاہتی ہے اور ہر آسمان کے نیچے ایک نئی زمین کی تلاش میں مصروف رہتی ہے۔ ایک ہی شخص سے دو مختلف مقامات میں دو متضاد پالیسی اختیار کرنا دو رُخی سیاست کا کمال ہے۔ اس کو ڈپلومیسی نہیں ڈپلوکیسی کہتے ہیں۔ انگریز اس فن کے ماہر تھے۔ حدیث نبوی ہے کہ شر الناس ذوالوجہین۔

دو رُخا آدمی بدترین انسان ہے۔ مگر جماعت اسلامی کو اب حدیث نبوی سے کیا سروکار۔ اُسے تو حدیثِ دوست مل گئی ہے۔ وہ پیرِ رومی کا دور تھا جب کہا جاتا تھا۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں
ایں خیال است ومحال است وجنوں

یہ ان کے مرید حضرت علامہ اقبال کا دور ہے جب جماعت اسلامی نے طمانیت قلب پہ شرح صدر کہی ہے۔

با چنیں روزِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
از جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

تازہ ترین اطلاع کے مطابق اگر جماعت اسلامی کو شکست دے کر مبارک شاہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہو جائیں۔ جماعت اسلامی کا زورِ جنوں اور پاس گریباں دونوں محفوظ ہیں۔

سو جوتوں سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

صدر بازار دہلی کا فساد، پولس اور سوشل ورکر

صدر بازار، دہلی کا فساد اس اعتبار سے ہندوستان کی نئی تعمیر کا خشتِ اوّل ہے کہ پہلی مرتبہ سوشل ورکرز بلائے گئے اور ان سے دریافت کیا گیا کہ آخر آپ حضرات کے رہتے ہوئے ۷۰ مرتبہ ایک ہی علاقہ میں چھوٹے چھوٹے فسادات کا سلسلہ کسی بڑے فساد کا پیش خیمہ ہے۔ آخر آپ حضرات کس مرض کی دوا ہیں۔ دہلی سوشل ورکروں کا لال قلعہ ہے۔ بھانت بھانت کے سوشل ورکر ہیں، کوئی شراب کے خلاف مہم چلا رہا ہے، کوئی سگریٹ نوشی کے خلاف مہم چلا رہا ہے۔ کسی نے آوارگی کے خلاف مورچہ لگا رکھا ہے، کوئی بلیک مارکیٹنگ کے خلاف آسن مار کر بیٹھا ہے۔ کوئی اسمگلنگ کے خلاف دھونی رما کے بیٹھا ہے۔ ان غریبوں کو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں کولہو کے بیل کی طرح فرضِ منصبی انجام دینے کی عادت ہے۔ دفعتہً جب یہ سوال ہوا تو بیچارے گھبرا اُٹھے اور بہت سوچ وچار کے بعد بولے کہ صدر بازار اور دہلی کے ہندو اور مسلمانوں کی بیویاں فساد کی جڑ ہیں۔

سوال کرنے والے ادارہ نے پوچھا کہ وہ کیوں کر؟ سوشل ورکروں نے جواب دیا کہ صدیاں گزر گئیں مگر ہندو اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے سے سناشا بھی نہ ہوسکیں۔ مردوں کو اتنی فرصت کہاں کہ اہل محلہ سے دوستی کرتے پھریں۔ یہ کام عورتوں کا ہے کہ ادھر مرد کمانے کی دھن میں گھر سے نکلیں اُدھر یہ بی بی پڑوسن کو اپنی سہیلی، اپنی منہ بولی بہن، اپنی خالہ، اپنی نانی، دادی بناتی پھریں۔ جب تک عورتوں کا اخلاق وسیع نہیں ہوگا صدر بازار

دہلی میں فساد کی روک تھام، دلوں کی صفائی، ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔ یہ سن کر سوال کرنے والے چکرا گئے۔ صنفِ نازک کا معاملہ ذرا نازک ہے۔ راقم الحروف کے مشاہدہ اور تجربہ نے ہر جھگڑا میں خواہ ہندو مسلم نوعیت کا ہو یا دیہی اور قصباتی نوعیت رکھتا ہو عورت کا درجہ بہت بلند اور فعال دیکھا ہے۔ مگر دہلی کے سوشل ورکروں نے پانسہ پلٹ کر رکھ دیا۔

خدا بھلا کرے ایک کانگریسی ادیب کا جو باقاعدگی سے ''ملاپ'' میں روزانہ پیاز کے چھلکے پڑھ کر اپنی تہہ بہ تہہ فکر کے رموز و اسرار فاش کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ایک ہی جھٹکے میں جائے حلال کر دی۔ فرمانے لگے واقفؔ صاحب یہ انگریزی اخبارات میں سوشل ورکروں کا افسانہ سو فیصدی طبع زاد ہے۔ جہاں سوشل ورکر ہوتے ہیں فساد نہیں ہوتا۔ جہاں فساد ہوتا ہے سوشل ورکر نہیں ہوتے کیوں کہ فساد کے بعد سب سے پہلے انہیں کو زیر حراست لے کر غنڈوں سے معاملات طے کرتی ہے۔ آپ کس چکر میں ہیں نہ جانے وہ کون سے مسخرے تھے جنہیں پکڑ کر سوال و جواب کی رسم ادا کی گئی۔

معلوم نہیں آپ میرے کانگریسی ادیب کی فلک بوس اور ہمالیہ شگاف تحقیق سے مطمئن ہوئے یا نہیں۔ مجھے تو فی الحال ان کی گفتگو سے اختلاف کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ راقم الحروف نے اس موقع پر کلدیپ نیّر، صدر کانفرنس کے نام اپنا منظوم پیغام شائع کیا تھا جس کے طنزیاتی نشتروں سے کلدیپ نیّر تلملا اٹھے تھے۔ ایک دو بند آپ بھی سن لیں۔

نقش فریاد نہ بن شوخیِ تحریر نہ دیکھ
کاغذِ پیرہنِ پیکرِ تصویر نہ دیکھ
تو ایڈیٹر ہے فقط اس کے سوا کچھ بھی نہیں
آگ خاکم بدہن گیر کہیں قرآں میں لگے
سلسلۂ آہِ شب مسلم دلگیر نہ دیکھ
تو ایڈیٹر ہے فقط اس کے سوا کچھ بھی نہیں

اس واقعہ کو کئی سال بیت چکے ہیں۔ آج صدر بازار، دہلی کے فساد کے بعد جناب کلدیپ نیّر کا خفتہ ضمیر ''اسٹیٹس مین'' کے صفحات پر بیدار ہو گیا اور مسلم اقلیت میں عوام سلامتی کے احساس کو رفع کرنے کی ذمہ داری اکثریت پر ڈالنے لگا ہے۔ صبح کا بھولا شام کے وقت گھر کی طرف واپس آ رہا ہے۔ آیئے کلدیپ نیّر خوش آمدید۔ مظلوموں کے قافلہ کو آپ کی اور آپ کے گمشدہ قلم کی تلاش ہے۔ رہ گیا عدم سلامتی کے احساس کا رفع دفع ہونا تو اس کی طرف سے آپ مطمئن رہیں۔ جب آپ آ گئے تو عدم سلامتی کا احساس کیوں کر باقی رہ سکتا ہے۔

ہارٹ لیس ڈیموکریسی، ہیڈ لیس ڈیموکریسی اور لائف لیس ڈیموکریسی

ایک نوجوان دوست جو کسی کالج میں اُردو کا پروفیسر ہے اور آج کل دیوانِ غالب کا بغور مطالعہ کر رہا ہے۔ کل سرِ راہ راقم الحروف سے پوچھ بیٹھا۔ آپ نے دل پر کوئی شعر کہا ہو تو سنائیے۔ میں سوچنے لگا، میرے مجموعۂ اشعار میں دل کہیں پر موجود ہے یا نہیں۔ میں نے نوجوان پروفیسر سے دل کے متعلق معذرت طلب کی۔ اچھا دماغ پر کوئی شعر کہا ہو تو عنایت فرمائیے۔ میرا سر چکرا گیا۔ دماغ پر شعر کہنا کتنا ضروری تھا۔ مگر افسوس میں نے پھر معذرت طلب کی۔ اچھا جانے دیجئے زندگی کے متعلق تو آپ نے کوئی شعر ضرور کہا ہوگا۔

مگر کیا عرض کروں کہ آج تک زندگی کے متعلق کوئی شعر موزوں نہ کر سکا۔ میں نے نہایت شرمندگی سے اعترافِ عجز کیا۔ نوجوان پروفیسر نے حیرت سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا، واقفؔ صاحب بڑی مایوسی ہوئی، جب آپ نے ''دل''، ''دماغ'' اور ''زندگی'' کو محروم توجہ رکھا تو دوسرے شاعروں سے کیا امید رکھی جائے۔ دیکھئے مرزا غالب کا چھوٹا سا دیوان ہے۔ اس میں کیا نہیں ہے۔ دل کے متعلق غالبؔ کا شعر ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

دیکھئے داغ کا شعر:

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں کارہائے بیجا کا

غالب نے کیا زندگی گزاری ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

زندگی اپنی کس رنگ سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو سارے ملک میں سڑکوں پر لاکھوں کا جلوس لے کر ترنگے جھنڈے کے ساتھ گشت کرتے ہوئے پانی پی پی کر چیخنا ہوگا کہ ہاٹ لس ڈیموکریسی بوگس ہے، ہڈلس ڈیموکریسی نہیں چلے گی۔ حکومت کی غلطیوں پر سخت ترین نکتہ چینی کرنے والے جے پرکاش نارائن بھی چپ ہیں۔ چھاتر سنگھرش سمیتی بھی چپ ہے تو راقم الحروف کو کیا پڑی ہے کہ بولتا پھرے۔

چھلنی میں دودھ اور قسمت کو گالی

چچا چھکن کے برخوردار بھتیجوں کو ''قسمت'' پر قسمت کے لکھے پر ''تقدیر'' اور کاتب تقدیر پر بے انتہا غصہ آیا اور انہوں نے اینٹی فیٹلسٹ تحریک چلانے اور تقدیر کے خلاف سنگھرش کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آل انڈیا ریڈیو نے اس خبر کو اہمیت دیتے ہوئے مکھ سماچار بنا کر ہوا میں پیش کر دیا، فضا میں اُچھال دیا۔

ریڈیو سے یہ خبر سنتے ہی اخبارات کے نیوز ایڈیٹروں کے قلم جلد جلد چلنے لگے۔ صفحہ اوّل کی چار کالمی تیار ہو گئی۔ چچا چھکن کے برخوردار بھتیجے سخت ناراض تھے کہ جب چچا چھکن چھلنی میں دودھ دوہتے ہیں تو کمبخت قسمت اس دودھ کو چھلنی میں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ چچا چھکن چھلنی میں دودھ دوہتے اور چھلنی میں نہیں ٹھہرتا اس سے بڑا ظلم، اس سے بڑی ناانصافی کیا ہو سکتی ہے؟

چچا چھکن نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ ایک سال کی مدتِ جنگ کے بعد ہم تقدیر کے قانون اور اس بیہودہ نیچر آف لاء کو بدل دیں گے۔ دودھ چھلنی میں دوہنے والوں کو دودھ گر جانے سے جو نقصان ہوتا رہا ہے اس کی شاندار تلافی کی جائے گی۔ ہم اسمبلی کو توڑ دیں گے، ممبرانِ اسمبلی کو مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنا استعفیٰ نامہ پیش کر دیں ورنہ:

جنتا ہے اگر زندہ بھارت کو بتا دیں گے
تقدیر کے لکھے کو چھلنی سے مٹا دیں گے

چھلنی بھی ہماری، دودھ بھی ہماری گائے بھینس کا یہ قسمت کون ہوتی ہے لاء آف نیچر بن کر ہماری محنت کو برباد کرنے والی۔ اگر کوئی دوسرا کہتا تو معلوم نہیں لوگ اس کے دماغ کے متعلق کیا کیا چہ می گوئیاں کرتے۔ مگر یہ بات چچا چھکن کہہ رہے ہیں جن کے پاس برخوردار بھتیجوں کی ایک اچھی خاصی فوج موجود ہے۔ لہٰذا یہ بات تو غلط ہو ہی نہیں سکتی جو چچا چھکن کو پاگل کہتا ہے، خود پاگل ہے، جو انہیں احمق سمجھتا ہے وہ خود بدھودی گریٹ ہے۔

راقم الحروف کو چچا چھکن اور ان کے بھتیجوں سے گالیاں سننے کا شوق نہیں۔ اس کی ہمت نہیں کہ چیف منسٹر عبدالغفور صاحب کی طرح صاف صاف برسرِ اسمبلی اعلان کر دے کہ دُنیا کا کام کاروبارِ فطرت کے سیدھے سادے اصول سبب پر چلتا ہے۔ انہیں ہر بات پر سوال کرنے کی عادت سے چیف منسٹر ہاؤس بھی محظوظ ہوتا تھا اور عاجز بھی رہتا تھا۔ بالآخر مسٹر گھوش کی خدمات لی گئیں اور انہوں نے اپنے دشنام آموز قلم سے ایک فقرہ ''امرتا بازار پتریکا'' میں لکھ دیا کہ موصوف ہیئت استفہامیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ سارا ہندوستان قہقہہ سے گونج اٹھا۔ اور ممبران سنٹرل اسمبلی، دہلی اس طرح چپ ہوئے تا کہ دمِ واپسیں وہ کچھ نہ بولے۔

مسز بھٹو کا زچّہ خانہ

مسز ذوالفقار علی بھٹو نے زچہ خانہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں معیاری زچہ خانوں کی ایک دنیا آباد کرنا میری زندگی کا مقصد اوّلین ہے۔ ادھر بیگم صاحبہ یہ کہہ رہی ہیں اور ادھر مسٹر بھٹو قادیانی اور غیر قادیانی کے سوال پر استعفیٰ پیش کرنے کا اعلان کر رہے ہیں۔ مان لیجئے تقسیم کار اس کا نام ہے۔ میاں بیوی دائرہ میں مصروفِ عمل ہیں:

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کئے جاؤ میخوارو کام اپنا اپنا

زچہ خانہ کے متعلق حسب ذیل سوالات کئے گئے۔

زچہ خانہ کا عملہ قادیانی ہوگا یا غیر قادیانی، یا دونوں پر مشتمل معجونِ مرکب؟

قادیانی عورتوں کے داخلہ پر کوئی قانونی پابندی عائد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

قانوناً ان کا داخلہ ممنوع نہ ہو تو ان کی راہ میں عملی دشواریوں کا پہاڑ حائل کیا جانا چاہئے یا نہیں؟

مسٹر بھٹو کے استعفیٰ کی دھمکیوں سے متاثر ہو کر قادیانی اور غیر قادیانی فسادات بند ہو گئے تو جنگ جوئی اور فساد انگیزی کے لئے کون سا میدان منتخب کیا جائے گا؟ کیوں کہ

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پاکستانی قوم شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کی زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز کو حدیثِ بے خبراں سمجھتی ہے۔

اس کے متعلق حکیم الامت نے فرمایا ہے کہ:

حدیثِ بے خبراں ہے کہ با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

یہ صحیح ہے کہ حکیم الامت نے یہ بھی دبی زبان سے کہہ دیا تھا کہ:

شبستانِ محبت میں صریروپرنیاں ہوجا

پاکستانی صریروپرنیاں ہونے کو تیار نہیں مگر شبستانِ محبت بھی تو ہو۔ یہ کمبخت قادیانی جب تک موجود ہیں شبستانِ محبت کی پہلی اینٹ بھی تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے والے زچہ خانوں کی ضرورت ہے۔ مسز بھٹو اس تکمیل کا آغاز ہیں۔ لہٰذا ان کی سہاگ کی چوڑیوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ بھٹو صاحب استعفیٰ پیش کرتے رہیں، وہ زچہ خانہ پیش کرتی رہیں اور دنیا عقلمندوں کے جہنم سے نکل کر تھوڑی دیر کے لئے احمقوں کی جنت میں پہنچ جائے۔

جمہوریت کی چڑیا کس شاخ پہ بیٹھی ہے

ایک مقامی روزنامہ اپنی اشاعت میں فاشسٹ کون؟ کے عنوان سے اداریہ لکھتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ ہمیں خوشی ہوگی اگر کوئی یہ بتا دے کہ جمہوریت نام کی چڑیا کس شاخ پر اور کہاں بیٹھی ہے؟

ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ معاصر محترم کو یہ بتا کر خوش کر دیں کہ جمہوریت نام کی چڑیا اس کے دفتر میں قلم کی سوکھی ہوئی ٹہنی پر بیٹھ کر اندرا کو مادر زاد ننگی گالیاں دیتی ہے اور راقم الحروف اس سے ایک مطبوعہ نظم میں اس سے پوچھتا ہے کہ:

اندرا کو دے رہے جو گالی وہ کیا ہوئی

اے ناشناسِ خواہر و مادر جواب دو

شاخ سے وہ چڑیا اُڑ کر فضائے خاموش کی طرف پرواز کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان عرف بھارت میں یا بھارت عرف ہندوستان میں اگر جمہوریت ہوتی تو معاصر موصوف کو آزادیاں میسر نہ ہوتیں کہ:

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

جمہوریت کی چڑیا والے مقامی روزنامہ نے سرودے لیڈر بابو جے پرکاش نرائن کو اداریہ کے آخر میں درجِ گزٹ کرتے ہوئے اپوزیشن کر دیا ہے۔ کلدیپ نیر کو بیان دیتے ہوئے بابو جے پرکاش نرائن نے کہا کہ اندرا صرف کشمیری برہمنوں سے گھری ہوئی ہیں۔

آپ اس روزنامہ سے پوچھئے کہ عبدالغفور کشمیری پنڈت نہیں کشمیری برہمنوں سے گھرے ہوئے نہیں، ایماندار بھی ہیں۔ یہاں کیوں ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے اور لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ لیجئے کہ دس ہزار ملازمین کو تنخواہ تقسیم کرنے والے جے پرکاش نرائن صرف کائستھوں میں کیوں گھرے ہوئے ہیں۔ ہر ماہ دس لاکھ روپے تنخواہ کی شکل میں کائستھوں کی جیب میں سے سرودے تحریک کے خزانہ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

کیا جمہوریت کی چڑیا والے روزنامہ کو اس کی خبر نہیں ہے؟ کیا جے پرکاش نرائن کی اصلیت کے متعلق اس کے سوکھے ہوئے قلم کی شاخ بریدہ بھی سرسبز ہو کر اعتراضات کی بہار لائے گی۔ راقم الحروف کی طرح آپ بھی جانتے ہیں کہ مدیر محترم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ آج کل ان کے سر پر امریکن بلاک اور جے پرکاش نرائن کی زر پاش حکمت عملی سوار ہے۔

سودا ہوا ہے مرغِ جنوں کے شکار کا
پھندا بنا رہا ہوں گریباں کے تار کا

آپ دیکھیں گے کہ اس موضوع پر جمہوریت کی چڑیا والا روزنامہ اپنی منقارِ فصاحت کبھی نہیں کھولے گا۔ مقامی معاصر موصوف اب کوتاہیٔ ذوقِ عمل کا شکار ہے۔ اس کے بازو کٹ چکے ہیں۔ اس کی نگاہیں سوئے زمین بکھرے ہوئے دانوں کی طرف ہے۔ صیاد کا پھیلایا ہوا جال ندیدی نظروں سے اوجھل ہے، اس کا انجام معلوم ہے:

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

سن رہا ہوں کہ جناب ڈاکٹر صدرالدین فضا اعلیٰ اللہ مقامہٗ جارہے ہیں اور برادر گرامی جناب سہیل عظیم آبادی آرہے ہیں۔

یہ بہار اردو اکیڈمی کی بات چیت ہے کسی دوسری جگہ کا تصور نہ فرمایئے۔

اگرچہ بہار گزٹ نے اس کی تصدیق اب تک نہیں کی ہے۔ پھر بھی یہ اطلاع اچھی خاصی اور معتبر اور مصدقہ کہی جاسکتی ہے۔

راقم الحروف نے چاہا کہ فضا صاحب کو الوداع کہہ دیں مگر خیال آیا کہ لوگ مجھے رمضانی میاں سمجھ لیں گے۔ پھر خیال آیا کہ چلو بھائی سہیل عظیم آبادی ہی کو خوش آمدید کہہ دیا جائے، مگر خوشامدی کی پھبتی خواہ مخواہ کون سنے۔

سہیل بڑا زبردست نام ہے۔ شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمتہ کی تحقیق یہ ہے کہ اس کی روشنی ہر چیز پر اس کی فطری ساخت کے مطابق اثرانداز ہوتی ہے۔ اچھے کو زیادہ سے زیادہ اچھا بنادینا اور برے کو زیادہ سے زیادہ برائی میں مبتلا کردینا ستارۂ سہیل کی روشنی کا ایک کرشمہ ہے جو قدرتِ خداوندی اپنے بندوں کو دکھاتی رہتی ہے۔

دفتر ہفتہ وار ''اتحادِ وطن''، پٹنہ سہیل عظیم آبادی کو شبانہ تشریف آوری کی مستقل باقاعدہ اور مسلسل چائے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ جب انہیں دیکھتا ہوں تو بلبلِ شیراز شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمتہ اپنی تحقیق کے ساتھ یاد آتے ہیں۔

مگر عربی زبان کے بہت بڑے شاعر متبنیٰ نے سہیل کے متعلق یہ دلچسپ تحقیق پیش کی ہے کہ جب ستارۂ سہیل طلوع ہوتا ہے تو حرامزادوں کی موت آجاتی ہے۔ متبنیٰ کہتا ہے:

انکر موتھم او نا سہیلٌ

طلعت لموت اولادالزناءِ

ترجمہ: میں سہیل ستارہ کی طرح والزناءِ حضرات کی موت کے لئے طلوع ہوا ہوں۔

ادھر متبنیٰ کی ذلیل تحقیق اپنے دماغ میں محفوظ رکھئے اور ادھر تشریف لایئے تو جناب سہیل عظیم آبادی کا ناول آپ کی خدمت میں پیش کروں جس کا نام ہے ''بے جڑ کے پودے''۔

اس ناول پر یو پی اردو اکیڈمی نے ہزاروں روپے کا انعامی نذرانہ بھی سہیل صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کو بہترین فنی ناول قرار دیا گیا۔ پٹنہ میں سہیل پرستوں نے اجتماع مبارکباد کر ڈالا اور اسلامیہ ہال میں چائے، پیسٹری، مٹھائیوں کی تقسیم در تقسیم عمل میں آئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر دل تھام کر سنئے۔ اس ناول کا موضوع ہے حرامزادہ۔ بے جڑ کے پودے کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔ آپ نے دیکھا حرامزادوں کو سہیل سے دلچسپی ہو نہ ہو مگر سہیل کو حرامزادوں سے کتنی گہری دلچسپی ہے۔ ناول بھی لکھا جا رہا ہے تو حرامزادوں کے متعلق۔ واقعی خالی نہیں جاتا تخلص کا اثر۔

غریب متبنیٰ نے انا سہیل کہہ کر اپنے دشمنوں اور حریفوں کو بھی دھمکی دی تھی اور اپنے معاصر سے گالیاں سنی تھیں۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ سینکڑوں برس کے بعد افقِ عظیم آباد پر کوئی سہیل عظیم آبادی سچ مچ طلوع ہو جائے گا۔ زیادہ حدِ ادب۔

علامہ اقبالؔ اور ایک طوائف

تحسینِ ناشناس سے خدا محفوظ رکھے۔ ہندوستان غیر منقسم کی ایک طوائف کو علامہ اقبال کے کلام سے عشق تھا۔ طبلہ کی تھاپ، گھنگھروؤں کی جھنکار، رقص کے تال، سارنگی کے سرگم کے ساتھ اس مغنیہ کی کوکتی ہوئی آواز میں شکوہ اور جوابِ شکوہ محفل میں پیش کیا جاتا تھا تو ہر شخص دل تھام کر رہ جاتا تھا۔ وہ طوائف بلا کی حسین اور نمائش حسن کے رنگ کی ماہر اداکارہ تھی۔ علامہ اقبال مرحوم کی زیارت کی غرض سے وہ بھی لاہور پہنچی۔ طبیعت دار سربراہانِ حکومت پنجاب جس میں سروں اور خان بہادروں کی ایک پوری فوج موجود تھی۔ اس طوائف کے لئے ایک محفل رقص و سرود کا انتظام کر بیٹھی۔ علامہ اقبال مرحوم بھی بصد اصرار بلائے گئے۔ انہیں اپنے کلام کی قدر دانی کا یہ طریقہ سخت ناپسند تھا کہ طوائفیں اپنی محفلِ رقص و سرود کو اس سے گرمائیں۔ مگر دوستوں، ہم چشموں اور ہم نشینوں کے اصرار سے مجبور ہو کر تشریف لے گئے۔ سازندوں نے ساز ملائے اور اقبال کے شکوہ پر اس کافر ادا حسینہ اس فتنہ قیامت کا رقص شروع ہو گیا۔

تا تھئی تھئی تت تا تھئی تھئی تت۔ ساز بجتے رہے۔ طبلے کے میٹھے بول سارنگی کی صدائے دلنواز گھنگھروؤں کی چھما چھم کی آواز سے سماں بندھ گیا۔ طوائف خاموش رقص کر رہی تھی۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ، پچیس منٹ اسی طرح گذر گئے۔ فضا پر سکوت نغموں سے لبریز تھی۔ سکوتِ نظمہ بنا ہوا تھا۔ وہ جیسے کچھ گنگنا رہی تھی۔ ٹھیک تیس

منٹ پر۔

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

سامعہ نواز ہوا۔ گانا شروع ہوگیا۔ قیامت میں قیامت آگئی۔ امنگوں کی رعنائیاں شکوہ اللہ سے خاکم بدہن کر رہی تھیں۔

مگر وائے بر حال ساز و آہنگ علامہ اقبال چونک اٹھے جب اس ظالم نے علامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

کبھی مجھ سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے

ناشناس کا ماتم کرتے ہوئے محفل کلامِ اقبال میں محو تھی اس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اقبال کب گئے اور کیوں؟

لاہور کے سارے اخبار نویس صحافت نگار اس محفل میں شریک تھے۔ وہ بھی اس حال میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے دن اخبارات میں اس واقعہ کی پبلسٹی میں ہر اخبار دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصلح، ریفارمر، مردِ مومن شاہین، شہباز، مردِ قلندر سب کچھ بن چکا تھا۔

بیچارے بانیانِ محفل چاروں طرف کی گالیاں سن رہے تھے اور انہیں حیرت تھی کہ رات بھر شریک محفل رہنے والے جرنلسٹوں کو صبح ہوتے ہی کلامِ اقبال سے زیادہ علامہ اقبال سے دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی۔

خندۂ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

جرنلسٹوں کی دنیا میں قول و فعل کا تضاد اس وقت بھی تھا جب بوالہوسوں نے عشق

پری کا شعار اختیار نہیں کیا تھا۔ آبروئے شیوۂ اہل نظر آس پاس ہی موجود تھی، زیادہ دور نہیں گئی تھی اور آج کا تو حال نہ پوچھیے۔ پٹنہ، کلکتہ، لکھنو، کانپور، دہلی، ہر جگہ صحافت نگار سوسائٹی عرف ریڈیو ایڈیٹرس کانفرنس غالب کا مرقع چغتائی بن چکی تھی۔ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ ہاں علامہ اقبال والی طوائف کا کیا حشر ہوا؟ اس کے متعلق گوپال متل ایڈیٹر ''تحریک'' دہلی مصنف ''لاہور کا جو ذکر کیا'' سے، براہ راست خط و کتابت کیجئے۔

فکر تونسوی ''ملاپ'' والے کو پیاز کے چھلکے سے کب فرصت ہے کہ علامہ اقبال اور غالب کی طوائفوں کو ڈھونڈھتے پھریں۔ قاضی عبدالودود صاحب پٹنہ بھی کسی حد تک مفید ہو سکتے ہیں۔ آپ انہیں حضرات سے اس ''اقبالِ طوائف'' کے متعلق باقی ماندہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

اے داغ تمہیں وصل کی تدبیر بتا دی
تقدیر کا ذمہ تو یہاں ہو نہیں سکتا

صدر جمہوریہ وی۔وی گری اور گناہوں کا سمندر

صدر جمہوریۂ بھارت وی۔وی گری نے جو کچھ اپنے بیان میں فرمایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت کا اخلاق بہت تیزی کے ساتھ روبہ جہنم ہوتا جارہا ہے۔

محترم المقام صدر وی۔وی گری نے کہا کہ ہندوستانی معاشرہ گناہوں کے سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ بے اصول سیاست، بے محنت دولت، بے ضمیر حصولِ عیش، بے کردار علم، غیر انسانی سائنس، غیر اخلاقی معیشت اور جذبۂ ایثار سے خالی عبادت ہمارے موجودہ معاشرہ کی خصوصیات ہیں۔ صدر وی۔وی گری شاید ارشاد فرمائیں کہ جو لوگ تندرست اور صحت مند ہیں مریضوں کا علاج کریں۔ بصد ادب گزارش ہے کہ خود صحت مند ہونا اور بات ہے اور مریضوں کا علاج خالص علمی اور فنی چیز ہے اس لئے خود صحت مند ہونا کافی نہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم ہونا شرط ہے۔ کیا صدر جمہوریہ ان معالجوں کے نام، پتہ کا اعلان کرسکتے ہیں جنہیں اپنی گرانقدر مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے ''جانا اور پہچانا تو'' کیا صدر جمہوریہ یہ بتاسکتے ہیں کہ تلسی داس کی کتاب رامائن کے علاوہ ہندوستان نے انگریزی اور ہندی، بنگلہ کسی زبان میں کوئی اخلاقی اور مجلسی تاریخ لکھی ہے جو یہ بتاسکے کہ بھائی کیسا ہونا چاہئے۔ راجا اور پرجا کے تعلقات کے اخلاقی اصول کیا ہیں۔ خیر وشر کی تمیز کیونکر کی جائے۔ حق وباطل کی جنگ میں بے سروسامانی کے باوجود حق کا ساتھ کیوں دینا چاہئے، کیونکر دینا چاہئے۔

گسائیں تلسی داس کی رامائن نہ ہوتی اوران کی رام دھن نہ ہوتی تو ہندوستان میں ہندو معاشرہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے ختم ہو جاتا۔

صرف لڑائی جھگڑے کشت وخون برادر کشی غلبہ واستیلا مکر وفریب کی تعلیم دینے والی پالٹیکل ہسٹری جب بچوں کو شروع سے آخر تک پڑھائی جائے گی تو انجام یہی ہوگا جو سامنے آرہا ہے۔ الیکشن تک تو خیر انہیں فرصت نہیں مگر نتیجہ الیکشن کے اعلان کے بعد ان کا فرض ہے کہ قلم اٹھا کر صفحۂ قرطاس پر اخلاقی تاریخ کے نقش ونگار ثبت کریں۔ جو کام تلسی داس نے کیا صدر گری کیوں نہیں کر سکتے۔ جناب فخر الدین علی احمد صاحب کو اخلاقی تاریخ اور تاریخی اخلاق سے دلچسپی نہیں۔ انہیں غالبؔ اور مرزا غالبؔ سے دلچسپی ہے اور غالب جو لڑکپن میں مجنوں پر پتھر اٹھاتا تھا اور اس پاگل کے سر کا علاج کر دیتا تھا۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

جوانی میں کسی سراپا ناز کے ساتھ پیش دستی کے اخلاقی جرم میں پٹ جانے کے بعد اپنا بیان جاری کر دیتا تھا۔

دھول دھپاّ اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اس کی طبیعت برسات کے نالے کی طرح اگر رُک جاتی تھی تو اور روانی پر آجاتی تھی اور نئی نئی تخریبی راہیں تلاش کر لیتی تھی۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

وہ بھارت کے حکمرانوں کی طرح بے انتہا ضدی بھی تھا۔ جب تک دوسرے اپنی خو نہ چھوڑیں یہ اپنی وضع بدلنے کو تیار نہ تھا۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کوئی بات ڈھنگ سے کی جائے تو لوگ کی سمجھ میں آسکتی ہے مگر غالبؔ اپنی پریشان گفتاری اور آشفتہ بیانی کو ہی حاصل حیات سمجھتا تھا۔

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ
یہی آشفتہ بیانی میری

رفتہ رفتہ اس نے لیڈروں کی طرح مہمل بھاشن دینا شروع کیا۔ مگر اس مہمل بکواس کو بہترین الفاظ سے آراستہ کرتا چلا گیا۔ جب بڑے بڑے ذی علم لوگ اس کی لغو تقریروں پر جھومنے لگے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

وہ موجودہ سیاسی الیکشن باز لیڈروں کی طرح اپنے پندار کا صنم کدہ ویران کر چکا تھا اور کوئے ملامت میں مارا مارا پھرتا تھا۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں لئے ہوئے

مگر جناب فخرالدین علی احمد کو غالبؔ ہی پسند آیا۔ فرمایئے اب قوم کا اخلاق درست ہو تو کیونکر۔ صدر وی۔ وی گری شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہیں عرصہ کے بعد عین الیکشن کے زمانہ میں بھارت کا زوال آمادہ اخلاق یاد تو آیا۔

اک نظر گھبرا کے اپنی طرف اس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہو گئیں

جب تک اخلاق کی حکومت کو تسلیم نہ کیا جائے، حکومت کا اخلاق درست نہیں ہو

سکتا۔ جب حکومت ہی کا اخلاق درست نہ ہوتو عوام کا اخلاق کیونکر درست ہو۔ الناس علیٰ دینِ ملوکہم۔ عوام الناس اپنے حکمراں کے مسلکِ اخلاق کو دانستہ یا نادانستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ شخص دور کا فلسفہ تھا۔ اب اصلی حکمراں عوام ہیں۔ جمہوریت نے انہیں ووٹ دینے کا حق عطا کیا ہے۔ اب ہر سیاستداں، ہر حکمراں، ہر وزیر، ہر لیڈر عوام کی دلجوئی میں اپنی کرسی کے حصول اور اس کی بقا کا راز پوشیدہ سمجھتا ہے۔

ہر شخص قانون کی حد سے نکل کر آزادانہ چہل قدمی کرنا چاہتا ہے اور اپنا قیمتی ووٹ اسی امیدوار کو دینا چاہتا ہے جو قانون شکنی میں اپنی ذاتی اثر ورسوخ کو اس کے لئے بے دریغ استعمال کر سکتا ہو۔ یہ تو عوام کا حال ہوا۔ اب قانون ساز اداروں کے ممبران یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے قوانین کو اگر ہم خود تسلیم کر لیں تو گویا اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے ہم نے خود سجدہ کر دیا۔

ہا! بیچارے غالبؔ مرحوم خدا ان کے مزار پر حکمرانوں کو پھول کی چادر چڑھانے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ کیا خوب کہا تھا:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

دو حرف

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

مولانا منظور احسن اعجازی صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب رشید الزماں اعجازی کے دولت خانہ پر خلقت کا ہجوم ہے۔ عورت، مرد، ہندو، مسلمان، چھوٹے، بڑے، اندھے، بہرے، لولے لنگڑے، مفلوج اور عجیب وغریب امراض سے مایوس مریضوں کو ایک شخص کے پھونک دینے سے افاقہ ہو رہا ہے، شفا ہو رہی ہے، لوگ صحت مند اور تندرست ہو کر بزرگوں کا چرچا کرتے ہوئے گھر واپس جاتے ہیں اور دوسرے دن سینکڑوں ہزاروں اشخاص کو اپنے ساتھ لا کر اس صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں ہزاروں حاجت مند پہلے سے موجود ہیں۔ اس شخص کا نام ''شاہ نسیم'' صاحب ہے۔ سمستی پور علاقہ کے رہنے والے بظاہر عام انسانوں کی طرح سادہ لباس میں رہنے والے نماز کے پابند جذبہ خدمتِ خلق اور بے لوث شفا بخشی کے نشہ میں سرشار لوگوں کو پھونکتے جا رہے ہیں۔ مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ سبزی باغ میں ایک طوفان سا آ گیا ہے۔ بڑے بڑے منکرین ومتذبذبین شاہ صاحب کی کرامتوں کے قائل ومعترف ہو چکے ہیں۔ مخدوم العارفین شیخ سعدی بلبل شیراز فرماتے ہیں۔

موجد بہ پائے ایزی و شب
چہ شمشیر ہندی برسرِ عرش

اگر عزّ و جاہ است و گر ذلّ و قید
من از حق شناسم نہ از عمر روید

یہ بیچارے اربابِ حال ومست است ہوتے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز و بے خبر بہار وخزاں دونوں سے یکساں طور پر بے پرواہ۔ علامہ اقبالؔ مرحوم نے انہیں کی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

یہ نالہ فصلِ گل و لالہ پر نہیں موقوف
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

ہر انسان کی شخصیت اس کے دماغ میں ہوتی ہے۔ آپ جو کچھ سوچتے ہیں وہیں آپ کی شخصیت ہے، وہیں آپ کی پرسنالٹی ہے۔ آپ کی فکر اور آپ کی اسلوبِ فکر کا دوسرا نام آپ کی شخصیت ہے۔ صوفیوں اور درویشوں کا اندازِ فکر بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے بہت مختلف ہوتے ہیں عام انسانوں سے۔ ان کی شخصیت لامقصود الا اللہ لاموثر فی الوجود الا اللہ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان کی عجائب کاریوں سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ساری کرامات کا راز وہی اسلوبِ فکر ہے جس کی ہلکی سی نشاندہی ابھی کر چکا ہوں۔

دوسروں کی بات جانے دیجئے۔ خود علمائے ظاہر کا ایک بہت بڑا طبقہ ملے گا جو عقیقۃ الاشیاء ثابت کی بحث ترکِ اسباب کے قائلین کو فعل حرام کا مرتکب قرار دے گا۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ خواجہ غریب نواز اجمیری ہوں یا سرکار غوث الاعظم بغدادی حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاری ہوں یا داتا گنج بخش لاہوری، حضرت مخدوم شمس الدین سمن سفید باز ارولی ہوں یا مخدوم تاج العارفین، پیر مجیب اللہ پھلواروی، شیخ محقق حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ہوں یا حضرت مولانا مخدوم منعم پاک، پٹنہ ہوں یا حضرت

مخدوم مولانا سمرقندی در بھنگہ سب اسی نشہ توحید میں مست ہیں تو خاموش رہ جاتے ہیں۔

نہ من تنہا دریں میخانہ ستم

جنید و شبلی و عطار ہم مست

ان علمائے ظاہر کا یہ حال ہے کہ جب علامہ اقبال مرحوم آیتِ معراج کی تفسیر لکھتے ہوئے یہ قابل صد ہزار تحسین و آفریں شعر لکھ جاتے ہیں۔

ہر کسے از رمز را آگاہ نیست

عبدہٗ جز سرّ الا اللہ نیست

تو برادر بسیارِ محترم مولانا عبدالماجد دریابادی کو صدق میں غصہ آ جاتا ہے۔ غریب اقبال مرحوم پر مشرک کے تبلیغ کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم حضور چشمہ ہدایت و رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ عبدیت کبریٰ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ہر سخن موقع و ہر نکتہ زکا ہے دارد۔

علامہ اقبال مرحوم اپنے محبوب آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو کر حاضر ہو چکے ہیں۔ خداوند عالم مولانا عبدالماجد زریابادی کو خضرؑ و الیاسؑ کی عمر عطا فرمائے۔ انہوں نے غور نہیں کیا کہ خلقت انسان کی ''علت لیعبدون'' ہے۔ عبادت و بندگی کا مقصد قربِ خداوندی ہے۔ سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔ قرآنِ کریم کی ہدایت ہے۔ قربِ الٰہی سرّ الا اللہ نہیں تو اور کیا ہے؟

قرآنِ کریم کی یہ آیت شاید علمائے ظاہر اور اسباب و نتائج کی زلف گرہ گیر کے اسیروں بالخصوص مولانا عبدالماجد دریابادی کو شاید مطمئن کر سکے۔

واللہ غالبٌ علیٰ امرہ ولکن اکثر الناس لایعلمون.

اور اللہ غالب ہے اپنے امر پر لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یہی وہ منزلِ یقین ہے جو عالمِ روحانیت یا آپ کی پسندیدہ اور پیاری بول چال

میں اسپریچول ازم کا منتہائے نظر ہے۔
علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کی گتھیوں کو سلجھانے کے بعد کوچہ تصوف کی طرف آئے تھے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر

ان کی ساری خودی اور بیخودی کی تان یہاں آ کر ٹوٹتی ہے۔

نظر الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغان صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں

دل چاہتا ہے کہ اس مختصر سے مضمون کو مولانا جلال الدین رومی کے ان اشعار پر ختم کر دوں۔

یادِ او سرمایۂ ایماں بود
ہر گدار زیادِ او سلطاں بود
یادِ او گر مونس جانت بود
ہر دو عالم زیرِ فرمانت بود

کرکٹ کا پہاڑ

یہ سبزی باغ پٹنہ ۴ ہے جہاں سے چھ روز نامے اور پینتالیس ہفتہ وار اخبار اور متعدد ماہنامہ رسائل نکلتے ہیں۔ بڑے، منجھولے، چھوٹے، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر جوتوں اور چپلوں پر سوار فرشِ راہ بنے ہیں جہاں بڑے بڑے شکمی جرنلسٹوں کے قلمی آپریشن پر عملی تجاویز کا خاکہ صرف اس لئے تیار کیا جاتا ہے کہ کہیں ڈبل ڈیلنگ کا باؤ گولہ عملی شکل نہ اختیار کرلے۔

جہاں اجڑی ہوئی جنت کی بہاریں خزاں میں سوکھ کر کانٹا ہو چکی ہوں، جہاں کے کارے نہ باشند کی عملی تعلیم مفت ہو، جہاں ہر شخص اپنی اپنی چار دیواری میں بندو سرخوش ہو، جہاں اخبارات کے دفتر کلب کی طرح بے دریغ استعمال کئے جاتے ہوں، جہاں ہر شخص اپنی ذات سے ہے اور جہاں ہر انجمن کسی ذات سے ہے، جہاں ہر شخص وہ حکایت ہستی کی داستاں ہو جس کی نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔

جہاں ہر طرف نالائق کارپوریشن کے عملے کوڑے کرکٹ جمع کرتے رہے، انبار تودے کی شکل میں چھوٹی بڑی پہاڑیاں دکھائی دیتی ہیں اور میر انیس مرحوم کا یہ شعر پڑھ رہی ہیں۔

خاکساری نے عطا کیا رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

یہ کارپوریشن کے منتخب ممبروں کا معاملہ ہوتا ہے۔ پٹنہ ۴ کا ہر باشندہ ان بیچاروں کی

بہنوں سے اپنا جنسی رشتہ جوڑتا ہوا جسمانی سوراخ میں انقلاب زندہ باد کی میخ ٹھونک دیتا۔ مگر یہاں ایڈمنسٹریٹر ہے۔ ایڈمنسٹریٹر ووٹوں کا بھکاری نہیں سرکاری عہدیدار ہوتا ہے۔ کسی سرکاری عملہ کے خلاف بولنا سبزی باغ پٹنہ۴ کی روایت قدیمہ کے خلاف ہے۔ جوئے غلامی ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ آزادی کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں طوفانِ قیامت برپا کر دیا، ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو'' سے ''سائمن گو بیک، سائمن گو بیک'' سے ''کوئٹ انڈیا مومنٹ'' بھی سبزی باغ کی دستورِ حیات میں خفیف سی تبدیلی کا حادثہ بھی رونما نہ ہو سکا۔

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
وہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

اب راقم الحروف کو اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نظر ہی نہیں آتا کہ بھائی شوکت علی فہمی ایڈیٹر ''دین دنیا'' دہلی کے مخصوص لب و لہجہ میں اعلان کر دے کہ سبزی باغ میں گندی نالیوں کے سر توڑ اور کمر جوڑ پانی کو سڑکوں پر رشوت کے روپیوں کی طرح بہنے دو۔ کارپوریشن ایڈمنسٹریٹر کو خوابِ راحت کے مزے لوٹنے دو۔ کوڑے کرکٹ کے انبار کو تودوں کی شکل میں تبدیل ہونے دو۔ خاک کے تودوں کو قانونِ ارتقا کے مطابق ہمالیہ پہاڑ بننے دو۔ قدرت ایک جامع انقلاب کی تیاری میں مصروف ہے۔

سرکاری سادھو، سرکاری ریلیجیس ڈیوائن کے ابّا جان

ہندو شاستر میں جوگیوں کی چار بنیادی خصوصیتیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) بال جوگی جو خدا کو اپنا رب سمجھ کر چھوٹے بچوں کی طرح اس کے دامنِ رحمت سے لپٹا رہے، (۲) پشاج جوگی جو تارک الدنیا ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں یادِ الٰہی کرتا رہے۔ اہل دنیا کو حتی الوسع اس کے وجود کا بھی علم نہ ہو سکے، (۳) اُدمات جوگی جو یادِ الٰہی کے استغراق میں مجذوبِ مطلق ہو چکا ہو۔ اس کو اپنے تن من کی فکر نہ ہو، (۴) راج جوگی جو فقیرے درلبا سے بادشاہ ہو جس کا کام حکومت کو صحیح راستہ پر چلانا ہو، حکمرانوں کو ہدایت وحفاظت ہو کبھی راج جوگی براہ راست بادشاہت کرتا ہے اور دنیا کو انصاف اور احسان سے مالا مال کر دیتا ہے۔ کبھی درباریوں اور سیاستدانوں کی صفوں میں بیٹھ کر اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے۔

مسلمانوں میں بھی فقراء اور دَرویشوں کی یہ چاروں قسمیں ہمیشہ موجود رہیں۔ خواجہ غریب نواز اجمیری، خواجہ عبداللہ احرار نقشبندی، خواجہ سلیم چشتی فتح پور سیکری، خواجہ باقی باللہ نقشبندی، شیخ سعدی شیرازی، مولانا رومی، خواجہ امیر خسرو بہت اچھے قسم کے راج جوگی ہوئے۔ آج بھی حکومتوں اور حکمرانوں کے نقشے ان کی روحانیت سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ آخری دور میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اسلامی طریقہ پر اور مہاتما گاندھی نے ہندوؤں کے جوگ شاستر کی روشنی میں راج جوگ کے اصول وضوابط کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ علامہ اقبال مرحوم تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کو راج جوگ اور خلافتِ الٰہیہ کی

تلقین کرتے رہے۔ان کی ساری کتابیں اسلامی طریقہ پر راج جوگ کا نصابِ تعلیم ہیں۔

ونوبا بھاوے ابتداء میں پتشاج جوگی تھے۔مہاتما گاندھی نے انہیں اپنے راستہ پر چلانا چاہا کہ ایک ذی علم آدمی اگر راج جوگی ہو جائے تو ملک کا بڑا فائدہ ہو سکتا ہے۔مگر ونوبا بھاوے اپنی ڈگر پر چلتے رہے۔ جے پرکاش نرائن کی صحبتوں میں رہ کر وہ پتشاج جوگی سے کامریڈ بن گئے۔اب نتیجہ یہ ہے کہ شیام نندن مصرا، ایم۔ پی ونوبا بھاوے کو سرکاری سادھو کہہ رہے ہیں۔راج جوگی اور سرکاری سادھو میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

راقم الحروف کو سرکاری سادھو سے زیادہ سرکاری ریلیجیس ڈیوائن جناب ولی رحمانی ایم۔ایل۔سی اور ان کے ہونہار ابا جان سرکاری امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی ہے۔

ابھی تو دیکھتے ہیں ظرف بادہ خواروں کا
سبو و خم کی بھی ٹھہرے گی دور جام کے بعد

قادیانی اور پاکستان

مولانا ثناء اللہ امرتسری زندگی بھر مرزا غلام احمد قادیانی سے مناظرے کرتے رہے۔ مولانا شاہ محمد علی رحمانی مونگیری نے کتابیں لکھیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے پنڈت جواہر لال نہرو کو قادیانیوں کے متعلق وہ سب کچھ لکھ دیا جو لکھنا چاہیے۔ مولانا شاہ علی شطاری نے قادیانیوں کے خلاف ہزاروں تقریریں کیں۔ مجلس احرار نے قادیانیوں کے خلاف تحریکیں چلائیں، دیوبندیوں نے انہیں غیر مسلم کہا، بریلویوں نے انہیں مرتد خارج از اسلام قرار دیا، علمائے فرنگی محل نے فتوے دے کر، الیاس برنی نے قادیانی مذہب جیسی نادر کتاب لکھی اور قادیانیوں کے پے بہ پے قاتلانہ حملوں کے باوجود سر سے کفن باندھ کر لکھی۔ مولانا معراج الدین ایڈیٹر ''الفقیہہ'' امرتسر تقسیم ہند تک قادیانیوں کے چہرے سے نقاب الٹتے رہے۔ مولانا احمد علی جیسے عالم نے حرائب الاصناف جیسی سینکڑوں کتابیں لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیں۔ مولانا مودودی بھی ایک کتاب لکھ کر پھانسی کے تختہ پر چڑھ کر اُتر چکے ہیں۔

اب بھی پاکستان کی بھٹو گورنمنٹ کو قادیانیوں کی صحیح پوزیشن کا علم نہیں۔ ساری دنیائے اسلام سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ بھائی جان ذرا خدا لگتی کہیے، یہ قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں یا وہابی، شیعہ، سنی، حنفی، بریلوی، دیوبندی ٹائپ کے اسلامی فرقوں میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ؟

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

سرزمینِ بھارت کی ایک پرانی کہانی ہے کہ ایک احمق برہمن لڑکے کو رامائن سنائی گئی۔ ساری رامائن سننے کے بعد اس نے پوچھا کہ سیتا مرد تھا یا عورت؟

راقم الحروف کے ولیعہد بہادر جناب اکبر امام کاشف جب تذکیر و تانیث کے گہوارہ میں تھے کہ ایک دن اپنے چھوٹے ساتھی کی زبان کی اصلاح کرنے لگے کہ پولس آ گئی کہنا غلط ہے؟ پولس مرد ہے، پولس آتا ہے اور وہ معصوم بچہ ان حضرت کو سند الوقت اور حجتہ العصر سمجھ کر ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ مجھے اس وقت دونوں بچوں کی باتوں پر ہنسی آ گئی تھی لیکن جناب بھٹو کے قادیانیوں کے متعلق چھان بین پر رونا آ گیا۔

گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

آنجہانی ہٹلر کی ایک تنظیمی حکمت

آنجہانی ہٹلر ایک لاجواب انسان تھے۔ کتابوں کی روشنی میں دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کی ایک اچھی خاصی تعداد ہمیشہ ان کے گرد مجتمع رہتی تھی۔ مگر خود آنجہانی دنیا کی روشنی میں کتابوں کو دیکھتے تھے اور سورج کی روشنی میں اس دنیا کو جس کا دوسرا نام عالم کون و فساد ہے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہر ۷۰ جرمن کی خفیہ نگرانی پر پارٹی کا ایک ممبر مقرر کر دیا جائے تو ان ۷۰ جرمن آدمیوں کے ذہنی رجحانات، طبعی میلانات، مسائلِ حیات وسائلِ زندگی اور دلجوئی سے ان کے دل و دماغ پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

خوبی آنجہانی میں یہ تھی کہ جو کچھ سمجھتے تھے اس پر عمل کرنے کی توفیق بھی انہیں ملی تھی اور آپ جانتے ہیں کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

شاید آپ یہ بھی جانتے ہوں کہ فعل وہ ہے کہ کبھی ہو کبھی نہ ہو اور عمل وہ ہے جس میں باقاعدہ تسلسل اور تواتر پایا جائے۔ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہیں اپنی سوچی ہوئی بات پر عمل کرنے کی ہمت اور فرصت میسر آ گئی۔ نتیجہ شاندار رہا اور وہ ''فیوہرر'' ہو گئے۔

اٹھارہ ہزار ووٹوں سے پارلیمنٹ کا ضمنی انتخاب حلقہ الہ آباد میں ہار جانے والے پیارے کانگریسی بھائی اگر گاندھی جی کا سبق بھول چکے ہیں جو ساری دنیا میں عدم تشدد اور

اہنسا کے واحد سیاسی مبلغ تھے تو کم از کم آنجہانی ہٹلر کی حکمت تنظیم کو اپنا انتخابی اصولِ حیات بنائیں۔ آنجہانی تو تشدد پر یقین رکھنے والے آدمی تھے۔ ہندوستان سے انہیں دلچسپی بھی تھی اور اپنے گھر بیٹھے نیتا جی سبھاش چندر بوس کو کانگریس کا صدر منتخب کرا سکتے تھے۔ گاندھی جی کے مایہ ناز امیدوارِ صدارت پٹا بھائی سیتارامیہ کو کانگریس کی بھری محفل میں نیتا جی کے ہاتھوں شکست کا مزہ چکھا سکتے تھے۔ آنجہانی ہٹلر ایرین نسل سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ انہیں ایرین نسل کی برتری کا بھی یقین تھا اور جرمنی کی یہودی اقلیت کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کا سیاسی اہتمام کرنا بھی جانتے تھے۔ الغرض مرنے والے میں بے شمار خوبیاں تھیں اور ان کی حکمتِ تنظیم کو نظر انداز کیا گیا تو خدا معلوم کس کس گوشۂ بھارت میں الہ آباد ہو جائے۔ کاش ان بیچارے کانگریسی بھائیوں کو علامہ اقبال کی یہ چیتاؤنی یاد آئے کہ:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ستوں چشمِ بد دور ہیں آپ دیں کے

خدا بخشے بھائی شوکت تھانوی مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بیہودگی اور بدمعاشی کسی کے باپ کی میراث نہیں، خدا جس کو جتنا چاہے عطا فرمائے۔ راقم الحروف کو وہابی، حنفی، دیوبندی، بریلوی، شیعہ، سنی کے باہمی اختلافات سے دلچسپی نہیں۔ اگرچہ مسائل کی تحقیق کے لئے ان کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ بحث مباحثہ بھی معلومات کا بہترین ذریعہ اور ذہنی تربیت کا وسیلہ ہے۔ اس حد تک ذمہ دارانہ مطالعہ بھی کیا گیا اور ہر مسئلہ میں اپنی رائے بھی قائم ہوئی۔ مگر وہ محاذ پسندی اور ہنگامہ آرائی جو اکھاڑے کے مولوی کی خصوصیت ہے، راقم الحروف کے پاس سے کترا کے نکل گئی۔

مولانا حالی نے مولویانہ ذہن کی متعصبانہ خصوصیات اور مولویوں کی نمایاں امتیازی کیفیات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی
جگر جس سے شق ہو وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی

ان کمزوریوں کو بیان کرتے ہوئے مولانا حالی کی بلیغ طنز بھی ملاحظہ فرمائیے:

ستوں چشمِ بد دور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلفِ رسولِ امیں کے

اب آیئے آپ کو ایک شیعہ پندرہ روزہ ''برأت'' بمبئی، جلد ۲، نمبر ۷ کے اقتباسات کی زیارت کرادوں۔ کوئی مرزا اطہر حسین صاحب ہیں، ایڈیٹر کو خط لکھتے ہوئے خالص تبرّائی انداز میں گہرافشانی فرماتے ہیں۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ یہی سوچ کر نقن نے شہیدِ انسانیت لکھی اور ان کا ابلیسی ذہن واقعی کامیاب نکلا۔ حمایت اور مخالف میں نقن گلی گلی مشہور ہو گئے۔ ہر جگہ نقن کا تذکرہ چل رہا ہے، باتیں ہو رہی ہیں مگر کس انداز میں۔ شیطان کے روپ میں، یزید کے ڈپلی کیٹ کے روپ میں۔ آج جو نقن کے ساتھ ہیں وہ دراصل یزید سے ہیں۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ نقن کون ہے۔ یہ ایک شیعہ مجتہد سید العلماءِ علی نقی صاحب کے نام خرابی ہے اور یہ بے نقط نثری قصیدہ تبرائیہ انہیں کی شانِ اقدس میں ''جرولی پارٹی'' کے ایک شیعہ مرزا صاحب نے تصنیف فرمایا ہے۔ بیچارے نقن صاحب نے ایک کتاب ''شہیدِ انسانیت'' لکھی اور ذرا سنبھل کر لکھی۔ سنّی حضرات بھی ناخوش نہ ہوں اور شیعہ حضرات بھی واہ واہ کر اٹھیں مگر نہ جانے کیا سنجوگ پڑ گیا کہ جس دن سے یہ کتاب نکلی ہے۔ نقن صاحب کے خلاف ''جرولی پارٹی'' کے شیعوں نے باقاعدہ تبرا ایجی ٹیشن چلا رکھا ہے۔ یہ خط اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ساون سے بھادوں دُبلا ہے۔ ایڈیٹر صاحب ''برات'' بھی بترائی ادب میں مقامِ امتیاز رکھتے ہیں جواباً ارشاد فرماتے ہیں۔

آپ کے خط کا ترکی بہ ترکی جواب کیا ہو سکتا ہے؟ یہی نا کہ آپ نے ہمیں جو ابلیس لکھا ہے تو ہم آپ کے باپ دادا کو ناصر حسین سے ظفر الحسن تک کو ابلیس کہہ کر لعنت کریں، لیکن یہ ہمارا کردار نہیں۔ آپ نے ہمیں دوزخی لکھا ہے۔ ہم آپ کے سارے ساتھیوں کو اور جن سے آپ کو حسن عقیدت ہے لکھ دیں لیکن ہم ایسا نہیں لکھتے۔ آپ نے ہماری فہم و فراست ہمارے تدوین و دیانت ہمارے خلوص و محبت اور ہمارے اعتقاد و ایمان پر حملہ کیا ہے۔ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اور آپ کے سارے ہمنوا مشرک کافر زندیق اور جہنمی ہیں

لعنتی ہیں، دروغ گو ہیں اختراع پرداز ہیں لیکن نہ جانے کیوں یہ ہمارا شیوہ نہیں۔

سبحان اللہ لیکن جانے دیجئے یہ ہمارا شیوہ نہیں کا جواب نہیں۔ آپ کے سامنے تہذیب، تمدن اخلاق و شرافت کا نمونہ اس لئے پیش کیا گیا کہ گلستان سعدی کی ایک عبارت ہے کہ لقمان را پرسید تذکرہ از کرآموختی؟ گفت از بے ادباں! حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا کہ ادب تم نے کس سے سیکھا؟ انہوں نے کہا کہ بے ادبوں سے۔

خدا آپ کو ہر شریف کو اس تبرائی ادب سے محفوظ رکھے، جس کے دو نمونے ابھی آپ کی نظروں سے گذرے۔

جانی پہچانی حقیقت اور امرِ ناشناس

ایک صاحب ہیں مولانا شہاب الدین ندوی۔ انہوں نے ایک کتاب نہایت ایمانداری سے لکھ دی ''ہماری تعلیم کا مسئلہ'' قیمت چالیس پیسے ادر فرقانیہ اکیڈمی ۱۶۴ پولس روڈ بنگلور-۲ سے شائع ہوگئی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی تیسری کانفرنس میں اس کی خواندگی ہوچکی ہے۔ کتاب اچھی خاصی ہے۔ اس میں کچھ ٹھوس تجاویز بھی ہیں اور حرفِ آخر بھی۔ حرفِ آخر میں مولانا ندوی فرماتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد علم برائے علم یا برائے معاش ہی نہیں بلکہ علم برائے جستجوئے حقیقت اور تعمیرِ انسانیت ہونا چاہئے۔

علم برائے علم یعنی برائے لذتِ علم بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ علم برائے معاش چھوٹے لوگوں کی باتیں ہیں اور علم برائے جستجوئے حقیقت اور تعمیر انسانیت ندوی گروپ کی خصوصیت ہے۔ گلاب کے پھول کو دیکھ کر میر تقی میر کہتے ہیں:

نازکی ان کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر تقی میر شاعر آدمی تھے۔ انہوں نے گلاب کی پنکھڑی دیکھی اور لبوں کی نازکی کو تشبیہ سے رنگین کر دیا۔ حقائق و مظاہر کا شعور احساس اور ادراک جس کو براہ راست ہو جائے وہ طبیعتہً شاعر ہو جاتا ہے۔ خواہ اس کے لب زندگی بھر ردیف اور قافیہ سے نا آشنا ہیں۔ علم ہر جگہ بڑھ رہا ہے۔ شعور ہر جگہ گھٹتا جا رہا ہے۔ دنیا کی اصلی عصبیت یہی ہے جب بادِ نسیم کی

اٹھکھیلیوں سے بیزار ہوکر لوگ بیٹھ جائیں تو جستجوئے حقیقت اور تعمیر انسانیت کا جذبہ ''ہندو مسلم فساد'' عالمگیر جنگ'' اور ورلڈ وار کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا شہاب الدین ندوی کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے علم کا گھوڑا زیادہ تیز دوڑتا ہے یا ان کے شعور کا ٹٹو؟

راقم الحروف کو ان کی ذاتِ گرامی سے اس لئے دلچسپی پیدا ہوئی کہ موصوف کو قرآن کی تحریف معنوی میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیتِ کریمہ کا ترجمہ اس آن بان سے کون کرسکتا ہے کہ ''معروف'' کا ترجمہ جانی پہچانی حقیقت اور ''منکر'' کا تر جمہ امرِ ناشناس ہو جائے۔ جانی پہچانی حقیقت تو پھول بھی ہے اور کانٹا بھی، زہر بھی اور تریاق بھی۔ مولانا ندوی کے علم کا گھوڑا بھی ہے اور شعور کا ٹٹو بھی۔ بلبل بھی ہے اور اُلو بھی۔ اندرا بھی ہے اور بھٹو بھی۔

پھر یہ امر ناشناس کیا بلا ہے جو منکر کے ترجمہ کے طور پر مولانا ندوی نے ہماری تعلیم کے مسئلہ میں درج فرما کر یہود و نصاریٰ کی عمنوی روحِ تحریف کو جہنم میں بھی پانی پانی کر دیا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی والو! تمہارے پاس جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ تمہاری پٹنہ کی شاخ بھی براتِ عاشقاں برشاخِ آہو ہے۔ خدا تمہاری جانی پہچانی حقیقت اور امر ناشناس دونوں پر رحم فرمائے۔

حضرت امیر المومنین عمر فاروقؓ صداقت آشرم میں

صداقت آشرم پٹنہ میں اردو کے مسائل اور ان کا حل کے موضوع سخن پر سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ جناب کامریڈ حبیب الرحمٰن سابق کمیونسٹ حال فی الحال کانگریسی اور آ گئے برائے صدارت جناب حیات اللہ انصاری ایم. پی. ایڈیٹر ''سب ساتھ'' دہلی، راقم الحروف کے ولی عہد بہادر جناب سید شاہ محمد اکبر امام کاشف کو سیمینار میں اپنا مقالہ پڑھنا تھا۔ مقالہ پڑھا گیا اور بحث کا آغاز ہو گیا۔ بحث حدودِ اخلاق وانسانیت سے متجاوز ہو کر مسٹر جناح مرحوم اور ملک کی تقسیم تک جا پہنچی۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنی معتدل تقریر سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا۔ یہ پہلی نشست کا ماجرا ہے۔ راقم الحروف اپنے ولی عہد بہادر کے ساتھ واپس چلا آیا۔ طبیعت آمادۂ سخن نہ تھی۔ ورنہ اس گرما گرم بحث میں اپنا حصہ بھی ہوتا۔ مگر دوسری نشست جو ساڑھے چار بجے شروع ہوئی پروفیسر عبدالمغنی سابق مقیم روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ، حال ساکن ہفتہ وار ہاتف، پٹنہ کے مقالہ پر ملک کے مشہور ادیب وافسانہ نگار جناب شبیر احمد، سابق رکن روزنامہ ''صدائے عام'' پٹنہ، حال رُکن ادارہ ''راہ رو'' روزنامہ پٹنہ نے اپنی بھرتی ہوئی تقریر میں بیچارے عبدالمغنی صاحب کے مقالہ کا ٹیٹوا دبا لیا۔ مغنی صاحب نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکے۔

گربۂ موت نے جو دھر دابا
کچھ نہ نکلا سوائے ٹیں ٹیں کے

اب برادرِ بسیارِ محترم جناب سہیل عظیم آبادی صدر مستقل اردو کمیٹی، بہار کانگریس

صداقت آشرم اپنے سر پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ حضرت عمر فاروقؓ کفار کی جماعت تھے۔ اس کے بعد جلیل القدر صحابی ہوئے۔ اسی طرح مغنی صاحب کل اگر ملک میں فساد برپا کر رہے تھے تو آج دیکھئے کتنے صلح کل اور صداقت آشرمی مرنجان مرنج بن چکے ہیں۔

جناب سہیل عظیم آبادی کے اس بے تکے ارشاد کے بعد بھرا ہوا مجمع تو بیزاری کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مغنی صاحب کی حالت قابل رحم تھی۔ اکبرالہ آبادی کا یہ شعر ہر شخص کو یاد آ رہا تھا۔

مذکر کے لئے ''ہی'' ہے مونث کے لئے ''شی'' ہے
مگر حضرت مخنث ہیں نہ سنّی میں نہ شیعوں میں

اچھا ہوا راقم الحروف اس وقت وہاں موجود نہ تھا ورنہ پوچھتا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے صداقت آشرم میں تشریف لائے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ کیا فرماتے ہیں لکھنو کے علمائے مدحِ صحابہ اس مسئلہ میں کہ صداقت آشرم میں جو کچھ ہوا وہ بے ادبی اور گستاخی تو ہین اور تبرا ہے یا نہیں بینو وتو جرو!

اور کیا فرماتے ہیں جناب ایڈیٹر ''سنگم'' پٹنہ کے ان کی صحبت میں جب تک جناب عبدالمغنی رہے حالتِ کفر میں تھے۔ اب انہیں صداقت آشرم میں اسلام کی دولت ملی ہے؟ اور کیا فرماتے ہیں جناب حیات اللہ انصاری لکھنوی فرنگی محلی مفتی اعظم ''سب ساتھ'' دہلی کہ صداقت آشرم میں حضرت عمر فاروقؓ کے تذکرہ کا اس طرح اچانک اور بے محابا چلا آنا گاندھی جی کی اہنسا اور عدم تشدد کی اسپرٹ کے خلاف ہے یا نہیں۔

اور کیا فرماتے ہیں پٹنہ کے اخباری دفتروں میں قلم گھسنے والے اور عظیم آباد کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخانے والے سینکڑوں ادیب اور شاعر و انشاء پرداز کہ صداقت آشرم میں جو کچھ کہا گیا وہ کنایہ ہے یا استعارہ؟ مجازِ مرسل ہے یا تشبیہ؟ تشبیہ تام ہے یا تشبیہ ناقص اور کیا فرماتے ہیں پروفیسر عبدالمغنی کہ راقم الحروف کا یہ مطلع مطلعِ صداقت آشرم ہے یا نہیں۔

اپنے ہی دھاگے میں خود شک آ پڑا
عقل کا چرخا بہت مہنگا پڑا

خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ میں چرچل

کل خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ میں کچھ سیمینار ٹائپ کی چیز ہو رہی تھی۔ کرسیٔ صدارت پر جناب سید علی عباس سابق آئی جی پولس رونق افروز تھے۔ پہلوئے صدر میں جناب عابد رضا بیدار اردو کی سوتی قسمت جگا رہے تھے جن کے سر پر آج کل لائبریری کے انتظام کے نقلی ہیروں کا تاج رکھ دیا گیا ہے جنہیں غالب مرحوم کی طرح تالیف نسخہ ہائے وفا کا ذوقِ سلیم ہے۔ مگر مجموعۂ خیال کا معاملہ غالب اور مغلوب دونوں کو ایک ہی ترازو سے تول دیتا ہے۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال بھی تو فرد فرد تھا

مجمع بھی دیوانِ غالب کی طرح چیدہ منتخب اور مختصر تھا۔

چار جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آساں نہیں صاحبِ دیوان ہونا

راقم الحروف بھی وہاں جا پہنچا۔ گلستانِ سعدی پر طبع آزمائی ختم ہو چکی تھی اور بیدار صاحب کے تنقیدی جملے پر بعض حضرات کو اعتراض ہوا۔ بیدار صاحب نے فرما دیا تھا کہ سعدیؒ دنیادار آدمی تھے۔ دراصل یہ نقطۂ نگاہ محترم قاضی عبدالودود صاحب کا ہے جو فیضانِ صحبت سے جناب بیدار کا سرسری جائزۂ نظر بن گیا۔ اس کے بعد ملک کے قدیم اور یٹراور

کمیونسٹ پلیٹ فارم کے معتبر رہنما حبیب الرحمٰن صاحب بول چکے تو راقم الحروف نے اپنا تبسّم پاش اور قہقہہ آفریں مقالہ ''مطالعۂ غالب'' پڑھ کر سنایا اور ہر فقرہ کی داد پر خالص شاعرانہ انداز میں تسلیم بجالاتا رہا۔ مقالہ کے بعد بہ اجازت صدر شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کے متعلق راقم الحروف نے اپنی تقریر میں اہل علم حضرات کے اس سنجیدہ مجمع کو یاد دلایا کہ دُنیائے ادب میں حضرت سعدیؒ ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ''گلستاں ایں چہ حرامزادہ مردانند کہ در بار السقہ سگہار اکشادہ'' لکھ کر لفظ حرامزادہ کو ادبی ڈکشنری کا جزوِلازم بنا دیا۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے عرض کیا گیا کہ اگر حضرت سعدیؒ کی سند استاد ذوق کے پاس نہ ہوتی تو رقیب کو اس آسانی سے حرامزادہ کہنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

پہنچا ہے اب کمند لگا کے وہاں رقیب
سچ ہے حرامزادے کی رسّی دراز ہے

استاد ذوقؔ کی تہذیب جب رقیبوں کے معاملہ میں گالیوں پر اُتر آئی تو مولانا ظفر علی خاں آف زمیندار لاہور کو موقع مل گیا اور تہذیب نو کے منہ پر وہ تھپڑ رسید ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو کہنا پڑا کہ مجھے زمیندار کی تحریریں بہت پسند ہیں مگر اس کی سوقیت اور بازاری پن سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

تہذیبِ نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرامزادی کا حلیہ بگاڑ دے

اس تقریر پر مسکراتے ہوئے جلسہ کا خاتمہ ہوا۔ خدا بخش خاں مرحوم کی لائبریری میں شیخ سعدیؒ کے ''حرامزادہ'' استاد ذوق کے ''حرامزادے'' اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی حرامزادی کا یہ تاریخی اور ذہنی اجتماع قابلِ ذکر تھا۔

امید کی ایک کرن عبدالغفور

اصلاح کا طریقہ وہ ہے جو بابو جے پرکاش نارائن کو معلوم ہے یعنی اصل مرض کی نشاندہی کبھی نہ کی جائے اور سارے ملک میں اپنی تیمارداری اور مسیحانہ ہمدردی کا صور پھونک دیا جائے۔ ہر احمق کو یقین ہو جائے کہ بابو جے پرکاش نرائن سر ودے کے چرخ چہارم سے زمین پر اس لئے نازل ہوئے ہیں کہ انہیں رشوت، کرپشن، بیروزگاری، مہنگائی، قحط اور گرانی کی مصیبتوں سے نجات دلا کر اطمینان کا سانس لیں گے۔

ملک کو بیوروکریسی سے کس طرح نجات دلائی جائے بابو جے پرکاش نرائن کبھی بولے؟ ملک میں بیوروکریسی کا رنگ محل ان کی آنکھوں کے سامنے تعمیر ہو گیا اور وہ دیکھتے رہ گئے۔

اپنے بیانات، انگریزی فصاحت و بلاغت کی بے مثال گلفشانیاں کرنے والے بابو جے پرکاش نرائن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں جس کی وضاحت ابھی کی گئی مگر کل بھی وہ اس موضوع پر خاموش تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ملک میں بیوروکریسی کا رنگ محل تعمیر ہو گیا اور وہ دیکھتے رہ گئے۔

اپنے بیانات، انگریزی فصاحت و بلاغت کی بے مثال گلفشانیاں کرنے والے بابو جے پرکاش نرائن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں جس کی وضاحت ابھی کی گئی مگر کل بھی وہ اس موضوع پر خاموش تھے اور آئندہ بھی رہیں گے کیوں کہ بیوروکریسی کا تصور لالہ شاہی کی

ترقی یافتہ شکل ہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے ہرگز خوشی نہیں مجھے یہ رنج وقلق ہے کہ بابو جے پرکاش نرائن بھی نوکرشاہی کی آلودگی سے پاک نہیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

عبدالغفور صاحب جانتے ہیں کہ بیوروکریسی کے درخت میں صرف رشوت خوری ہی کے پھول کھلتے ہیں۔ اس درخت سے صرف ذخیرہ اندوزی، مہنگائی اور گرانی، بلیک بازاری ہی کے پھول توڑے جا سکتے ہیں۔ عبدالغفور صاحب کی نگاہوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ بہار کی حکومت نام ہے صرف بحالی، ترقی اور تبادلہ کی سیاست کا۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں صورتوں میں بہار کی ہر ذات، ہر کنبہ، ہر برادری کے لوگ اپنی کمیونٹی کے تحفظ کے لئے براہ راست حکومت پر قبضہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ نوکرشاہی لیڈرانِ کانگریس کے حصے بخرے کر چکی ہے۔ کانگریس کے عناصر میں وہ ظہورِ ترتیب نہیں جس سے زندگی پیدا ہوتی ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

مسلم کلچر اور اقلیتی کردار صدائے ماضی سے نوائے حال تک

میں یہاں تین سال وائس چانسلر رہا۔ اس وقت سے اور اس کے بعد سے آج تک اقلیتی کردار کے بارے میں سنتا رہا۔ لیکن اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اقلیتی کردار ہے کیا چیز۔ بدرالدین طیب جی نے یہ بیان اس وقت دیا تھا جب ۱۹۶۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دورہ پر تشریف لائے تھے۔

چھ سال کی مدتِ لیل ونہار زندگی کے دورِ جام کی سینکڑوں گردشیں دیکھ چکی ہے مگر بدرالدین طیب جی کا یہ قرض ادا نہ ہو سکا۔

میں نہیں سمجھتا تھا کہ طیب جی کا یہ قرض اتنا زیادہ ہے کہ علی گڑھ یونین اس کو ادا کرنا چاہتی تو اس کی عقل ومنطق آفرینی کا خزانہ خالی ہو جاتا۔

حافظہ کی بھول بھلیاں اس تاریخی واقعہ کو یاد کر رہی ہے جو ۱۹۶۸ء سے بہت قبل کا ہے جب مسلم لیگ اپنی تنظیم کے مراحل سے گزر رہی تھی، تجویز پاکستان ریزرویشن کی منزلِ رستخیز ابھی دور تھی۔ قائداعظم مسٹر جناح اور دوسرے لفظی گورکھ دھندے کا حصار جا بجا تعمیر کر دینا باعث فخر سمجھتے تھے۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو کو عادت کے مطابق غصہ آ گیا اور انہوں نے مخصوص لہجے میں للکار کر کہا، میں صبح سے شام تک مسلم کلچر کا شور سنتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا

ہوں مسلم کلچر ہے کیا؟ پاکستان میں صرف چند اردو اخبارات کانگریس کی حمایت کا فرض اصولاً خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے ورنہ سارے اخبارات ساری اُردو صحافت مسلم لیگ کے افکار و جذبات وعزائم کی ترجمان تھی۔ مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ اگر مسلم کلچر کی صحیح تعریف کی جائے تو وضع قطع، لباس، زبان، طرز وادا کے کمزور مورچہ پر قائداعظم جناح کی شخصیت کا طول وعرض شکست کا منظر پیش کر رہا تھا۔

آزاد ہند کلکتہ مدینہ بجنور اور الجمیعۃ دہلی نجیب الطرفین کانگریسی اخبارات کو خواہ مخواہ اپنی شانِ کج کلاہی دکھانے کے مواقع حاصل ہو جاتے۔

ازلاہور تا کلکتہ سارے مسلم لیگی اخبارات شش و پنج کی کیفیت میں مبتلا تھے۔

مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک لکھنوی انقلاب لاہور بھی مسلم کلچر کے موضوع سے ہر روز دامن بچا کر نکل جاتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا اخبار زمیندار بھی مولانا کی انتہائی سنجیدہ اور شریفانہ نظم ''اہنسا کی دھرم پتنی کو سنگم پر پڑا پالا''، ''رضا کارانِ مسلم لیگ کی اٹھتی جوانی سے'' چھاپ کر ساکت وسامت تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا مسلم کلچر گویم وگرنہ گویم کی مشکل منزل سے گذر کر مسلم لیگی اخبارات میں قبلہ پہلے آپ کے مرحلہ سے دوچار تھا۔

ان کی امیدوں کا مرکز اب صرف سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذاتِ گرامی تھی جن کی تحکمانہ اندازِ نگارش، سہل وسادہ و پراثر تھی، استدلال نے شہرت وامتیاز کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ معلوم نہیں کسی کی درخواست پر یا خود بخود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنا فونٹین پین اٹھا لیا اس میں نئی روشنائی ڈالی اور لکھنے لگے۔ مولانا مودودی کے خیالات کے آسمانی فرشتے مسلم لیگی اخبارات کے قلب صفحات پر آہستہ آہستہ نازل ہونے لگے۔ ان کے رشحاتِ فکر نے دوست، دشمن دونوں کو محوِ حیرت کر دیا اور ہر شخص سوچنے لگا کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہا کہ مسلم کلچر ہے کیا؟

گویا یہ پنڈت جواہر لال نہرو کا قرض تھا جو مسلم لیگ کے ذہنی سرمایہ دار ادا کرنے سے گریز کر رہے تھے اور مسلم عوام کا پیمانہ انتظار تقریباً لبریز تھا۔ بالآخر ہندوستانی مسلم سیاست کی نازک ترین ساعتوں میں علی گڑھ ہی کا ایک اولڈ بوائے کام آیا۔ مولانا شوکت علی مرحوم نے الٰہ آباد کے مسلم لیگی جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے گرجتے بادلوں اور کڑکتی بجلیوں کی آواز میں ارشاد فرمایا کہ جواہر لال پوچھتے ہیں کہ مسلم کلچر ہے کیا؟ جاؤ ان سے کہہ دو کہ مسلم کلچر وہ ہے جو مسلم کلچر ہے۔ مجمع سے ایک فلک بوس نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے سوال کا مسکت اور تشفی بخش جواب دیا جا چکا تھا۔ مولانا شوکت علی مرحوم کے اس جواب پر کانگریس کے حلقہ میں اس وقت بھی قہقہے لگائے گئے تھے اور آج بھی اس پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر جواب لغو مہمل نہ تھا۔ اندازِ بیان کے متعلق کچھ عرض کرنا ذکر الموتی بالخیر کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تجاہل عارفانہ کا جواب اس سے بہتر ممکن ہی نہ تھا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

عرصہ کے بعد علی گڑھ کے سلسلے میں طیب جی کا حوالہ دیتے ہوئے دہلی کے بعض جرائد میں یہ بحث پھر چھڑ گئی ہے کہ اقلیتی کردار ہے کیا؟ ادائے قرض ہو یا ادائے فرض بہر صورت گذارش ہے کہ اقلیت نام ہی ہے اس گروہ کا جو کسی ملک میں وطنی قومیت کو قدر، مشترک کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہو مگر اس کے امتیازی خطوط و نقوش دوسروں سے مختلف اور ممتاز نہ ہوں مگر ان کے خطوط کو مٹا دیا جائے تو بحیثیت اقلیت اس کا وجود ختم ہو جائے اسی کو اقلیتی کردار کہتے ہیں۔ یہ کاغذ پر کھینچی ہوئی الفاظ کی دستوری تصویریں نہیں کہ آنکھ والے ہی ان کے جلوؤں کا تماشہ دیکھیں۔ کھیت کی پگڈنڈیوں پر چلنے والے اندھے بھی انہیں اپنی لاٹھی سے ٹٹول کر نشانِ راہ پا سکتے ہیں۔ صاف سنئے کہ اقلیتی کردار وہ حد فاصل ہے جو

دوسروں سے ہمیں جدا کرتی ہے۔ اگر یہ حد فاصل توڑ دی جائے تو ممکن ہے قوم باقی رہے مگر اقلیت ختم ہو جائے گی۔ جو لوگ بدیہیات میں بھی منطق آرائی اور فلسفہ طرازی کا شیوہ اختیار کرتے ہیں ان کا درد حد سے گزر کر دوا ہو جاتا ہے۔ وہ دریا میں فنا ہو کر عشرتِ قطرہ بن چکے ہیں۔

اس حد فاصل کو تہذیب کہیے، کلچر کہیے، روایات کہیے، زبان کہیے، رسم الخط کہیے، جو جی چاہے مگر اس کی ہر لکیر اقلیت کا نقش وجود ہے۔ اس کو مٹا کر اقلیت اکثریت بن سکتی ہے مگر اقلیت باقی نہیں رہ سکتی۔ ہاں یہ بات بھی ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ ''وطنی قومیت'' جس کو قدرِ مشترک کے طور پر کسی ملک کی اقلیتیں اور اکثریت تسلیم کرتی ہے دائرہ میں مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس مرکزی دائرۂ کشش کے نقطہ سے نکل کر اگر کچھ سوچا گیا تو اقلیتی کردار نہیں جو دو قومی نظریہ یا سہ قومی نظریہ ہے۔ اقلیتی کردار جس طرح اپنے امتیازی خطوط پر اصرار کرتا ہے اسی طرح مرکزی نقطہ قومیت پر بھی زور دیتا ہے۔ اس توازنِ فکر و عمل سے وہ صورت حال پیدا ہوئی ہے کہ وطن کی چار دیواری فخر کے ساتھ اعلان کرتی ہے۔

ایں خرابات مغان است دریں اندانند
کار گبرو مسلمان و نصاریٰ و یہود

آیئے اب ذرا ''وطنیت اور قومیت'' کی براتِ عاشقاں بر ''شاخِ آہو'' بھی ذہن کے تاریخی دریچے سے دیکھ لی جائے۔ وطنیت اور قومیت انسانی فطرت کی ان کمزوریوں کی یاد تازہ کرتی ہے جب انسانی قبیلوں میں تقسیم ہو کر مختلف کوہستانی علاقوں میں صحرائی جانوروں کے شکار پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی ترکتاز اور جدو جہد مشترک تھی۔ اس کا نفع اور نقصان مشترک تھا۔ وہ فطری انس ومحبت کے علاوہ معاشی یکسانیت کی زنجیروں میں اس طرح گرفتار تھا کہ اگر کبھی اس کو اپنا قبیلہ آزاد کر دیتا تو اس کی زندگی جاں گسل نظر آتی تھی

اس لئے سردارِ قبیلہ کے جا و بیجا احکام کی تعمیل بسر و چشم بجالانا وقت کی سب سے بڑی دانشمندی اور مصلحت اندیشی سمجھتا تھا۔ نیم وحشیانہ انسانی زندگی جب پتھریلی چٹانوں سے آگے بڑھ کر کھیتوں کی ہریالی میدانی علاقوں کے سرسبز و شاداب کشت زاروں میں منتقل ہونے لگی اور دشمن قبائل جو غذا کی تلاش میں سرگرمِ جستجو ہو کر گرد و پیش کے ہمسایہ قبائل پر چھاپے مارتے تھے۔ فطرت کے قانون پر عمل کرنے والوں کو لہلہاتی ہوئی کھیتوں کی جنت ارضی میں شاد کام و بامراد مستغنی اور بے پروا اپنی اپی ہوئی تلواروں کو حاکم وقت مان کر سرسبز شاداب علاقوں میں زندگی بسر کرنے والے قبائل پر یلغار کر دیتے تھے۔ اس وقت وطن کا تصور پیدا ہوا جو خالص سیاسی اور معاشی تھا۔

لہلہاتے ہوئے مرغزاروں اور زمین کے سینہ سے سبز سونا نکالنے والے محنت کش کسانوں کے لئے یہ سمجھنا بہت آسان تھا کہ اگر ہمارے قبیلہ کی جان بچ گئی مگر زمین پر دوسروں کا قبضہ ختم ہو گیا تو ہم بھوک پیاس، بدحالی اور نیم وحشیانہ زندگی کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ سونا اگلنے والی ہماری زمین کا ایک ایک چپہ ہماری رگِ حیات کا خون ہے۔ ہر قیمت پر اس کی حفاظت ہونی چاہئے۔ فطرت کی درسگاہ سے انسان کو اپنے کوہ و بیاباں سے محبت کا سبق ملا تھا۔ احتیاج کی درس گاہ نے اس جذبہ کو عقل و خرد کا نظریۂ حیات بنا دیا۔ یہ ہے قومیت اور وطنیت کی مختصر سی داستانِ اوّلین۔

مہذب دنیا آج تک اس پر کوئی اضافہ نہیں کر سکی۔ ہندوستان کی زرخیز زمین نے اس کے قدیم باشندوں کو اس ملک میں اسی نظریہ معاش و سیاست کے ساتھ جینا سکھایا تھا۔ حملہ آور آریہ قوم کے ہاتھوں شکست کھا کر ان کے جذبہ وطنیت بلکہ نظریۂ وطنیت کو بھی ٹھیس لگی۔ انہیں اپنی قبائلی زندگی کی طرف واپس جانا پڑا جہاں وہ ساری دنیائے انسانیت کے دل کا درد بن کر موجود ہیں۔

مگر حملہ آور آریہ قوم نے نظریہ وطنیت کو افادیت کے علم الاصنام میں اس طرح سمو دیا

کہ وطن کا ذرہ ذرہ دیوتا بن گیا۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی ابتدائی زندگی کی شاعری میں خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے لکھ کر برہمن فلسفہ وطنیت بلکہ وطن پرستی کی ترجمانی کی ہے۔

آریائی نیشنلزم جو مغربیت اور بالخصوص برہمنی ذہنی تربیت کا شاہکار ہے۔ ہندوستان پہنچ کر صرف مہاتما گاندھی کی جے ہی نہیں وندے ماترم بھی کہنے لگی۔ اس کو انگریزوں سے نیشنلزم کی بنیاد پر اختلاف تھا اور نیشنلزم سے ہندوازم کی بنیاد پر والہانہ محبت۔ ہندوازم ملک کی اکثریت کا مذہب تھا۔ معاشیات جذبات اور ہزاروں سال کی وطنی پرستش نے مل کر جو شکل اختیار کی اس کا نام آل انڈیا نیشنل کانگریس ہے۔

سخت کار تھا جس نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

گنگا اور جمنا کو آپ صرف دریا سمجھتے رہیں، اس کو دیوتا سمجھنے والے کروڑوں کی تعداد میں اس طرح زمین کی چھاتی پر سوار ہیں جب امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو آزادی کی تقریر کرنی پڑی تو بیساختہ بول اٹھے کہ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک گنگا اور جمنا کی مقدس سرزمین کو آزاد نہ کرالیں۔ علمائے کرام کا ایک بڑا طبقہ آزادی کی جنگ میں سپہ سالاری کے فرائض انجام دے رہا تھا اس کو بھی یہ جملہ کچھ عجیب سا لگا مگر ''بریلی'' سے کفر کا تازہ بہ تازہ فتویٰ شائع ہو گیا جس میں لکھا گیا کہ معبد کفر کو مقدس کہنے والا...... ہے الفرض ہندو نیشنلزم کا تصور مسلم نیشنلزم سے بنیادی طور پر جداگانہ ہے۔ احمق ہندو نیشنلسٹ ہندو لیڈروں نے اپنے تصورِ نیشنلزم کے مطابق ہمیشہ گفتگو کی اور مسلمانوں کی بے رُخی کے شکوہ سنج رہے۔ دوسری طرف قیامت یہ ہوئی کہ علامہ اقبال مرحوم جن کے علمی اور فکری پیغامات نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ میں سب سے بڑا رول ادا کیا تھا، کچھ سوچ سمجھ کر وطنیت کی مخالفت کر بیٹھے۔

ایک حدیثِ نبوی ہے حب الوطن من الایمان۔ وطن کی محبت بھی ایمان کا جزو

ہے۔ مگر علامہ اقبال نے اس حدیثِ شریف کی تاویل کی ہے:

ارشادِ رسالت میں وطن اور ہی کچھ ہے
آئینِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ ملّت کا کفن ہے

اتنا ہی نہیں علامہ اور بھی اپنے نظریہ کی وضاحت فرماتے ہیں:

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

مسلمان نیشنلزم کی اس انتہا پسندی کو شرک و کفر سمجھتے تھے، سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے، جو خدا کے سوا کسی کے متعلق پرستش کا جذبہ پیدا کرے۔ عام نیشنلسٹ کا دماغ اس نزاکت کو سمجھنے سے معذور تھا۔

اب مسلمان کیا کریں؟ کے انداز میں سوچ رہے تھے۔ شُدھی اور سنگٹھن کی آندھیاں بھی چل کر آزادی کے انتظار میں خاموش ہو چکی تھیں۔ ان ساری باتوں کے نتائج ''دوقومی نظریہ'' اور ''پاکستان''، ''ملک تقسیم''، ''کشت وخون''، ''خانہ جنگی''، خانہ بربادی اور مسلم اقلیت کی پامالی ہندوستان میں اور ہندو اقلیت کی خستگی پاکستان میں ہر جگہ اقلیت میں احساسِ، غیرت بے اطمینانی، خوف وہراس کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

''دُنیا کے نقشہ پر پاکستان کا وجود'' ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے اس اعتبار سے غیر خوش آئند تھا کہ ہر لمحہ ان کی وفاداریٔ وطن پر شک وشبہ کرنے والے بہت آسانی سے پاکستان کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت جن لیڈروں کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی انہیں تعمیرِ پاکستان کے لئے کراچی پہنچنا تھا اور وہ پہنچ گئے اور جو لوگ یہاں رہ گئے انہیں سجدۂ سہو کا فن

معلوم تھا۔ ان کا جرم بخشیدہ تھا مگر عام مسلمان بے سر کی فوج تھے اور آج تک ہیں۔

ہندو مسلم تعلقات میں تلخی اور برہمی نہ سہی مگر لطف و محبت کا رنگ بھی نہیں۔ دلوں کی صفائی اور اعتماد کی فضا صد نامہائے شوق بہ عنقا نوشتہ ایم بن کر وقت کا انتظار کر رہی ہے۔ ان حالات میں جو کچھ ہوا غنیمت تھا جو کچھ ہو رہا ہے غنیمت ہے۔ نیشنلزم کا تصور ''راشٹریہ کرن'' ہو یا مسلم تہذیب و ثقافت کا مرن برت ایک ہی ہے۔ مسلمان وطنیت کے بت کو سجدہ نہیں کر سکتے تھے جس کا ذہنی مطالبہ اسکولوں اور کالجوں میں بالخصوص تھا۔ یہ چیز ان کی مذہبی اسپرٹ ہی نہیں حکم مذہب کے خلاف تھی۔ مسلمان اپنے نقوشِ امتیاز کی کھل کر حفاظت تو کیا نشاندہی بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مبادا ان پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کر دیا جائے۔

پھر بھی مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور ہر جگہ بلند کی۔ تاریخ شاہد ہے زمانہ ماضی قریب کا ہر لمحہ اس کا گواہ ہے۔ آواز میں مطالبہ رکھ رکھاؤ نہ سہی التجاؤں اور عرضداشتوں کی نرم و سبک لب و لہجہ سہی مگر خاموشی کا جرم ان سے سرزد نہیں ہوا اس لئے خداوند کریم کی رحمت سے امید ہے کہ ان کی سیاسی مغفرت ہی نہیں سربلندی کا کوئی سامان غیب سے پیدا ہو جائے۔

مگر کانگریس کی پیہم سرد مہری نے انہیں اس حد تک افسردہ کر دیا کہ اب انہیں ہر اس پارٹی سے ذہنی وابستگی ہو جاتی ہے جو کانگریس کو شکست دے سکے، اس کو ناکامیوں اور نامرادیوں کے اندھے کنوئیں میں پہنچا سکے۔

انہیں اب جن سنگھ سے بھی مقابلتاً وہ نفرت نہیں اور بابو جے پرکاش نرائن کی تحریک کو تو ہر مسلمان اس طرح دیکھ رہا ہے کہ گویا اس پر خدا کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس کے ''اقلیتی کردار'' کو مجروح اور آہستہ آہستہ معدوم کر دینے والی کانگریس مبتلائے صد اضطراب ہے۔

مسلم کلچر اور اقلیتی کردار - خطرات ہی خطرات

بہار میں جو مسلم قیادت اس جرمِ عظیم کا ارتکاب کر رہی ہے اس کے متعلق نظم و نثر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ سرِ دست اس کے متعلق کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ مسلم اقلیت کے لئے اس سے بڑی خوشخبری کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے حقیقی دشمن کانگریس کے مقابلہ میں تیغ و سپر کی نمائش کے لئے میدان میں نکل پڑے ہیں۔ کانگریسی حکومت ہو یا کانگریسی حکومتیں، کانگریس پارٹی ہو یا کانگریس لیڈر شپ اپنی بقا کے لئے انہیں موت کے گھاٹ اُتارنے پر مجبور ہے۔ کتنی صاف اور سیدھی بات ہے مگر:

شیخ طبعاً آشنائے معنیٰ بیگانہ تھا
ورنہ کتنا صاف مضمونِ خطِ پیمانہ تھا

مسلم اقلیت جو آزادی کے بعد ہر لمحہ ہدفِ مظالم رہی آج اپنے قاتلوں کی حفاظت وحمایت میں کانگریس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہونے لگی ہے تاکہ مستقبل کا مورخ لکھ سکے کہ مسلمان مظلوم ہی نہیں احمق بھی تھے۔ حالات کا رُخ اگر اس طرح بدلا کہ جے پی کی اٹھائی ہوئی تحریکِ انقلاب اگر ناکام ہوگئی تو ناکام انقلاب کا دوسرا نام بغاوت ہے یا نہیں۔ کانگریس جس کے ذہن و دماغ کے اوپر کا نقشہ آپ کی نگاہ کے سامنے ہے۔ سارا زور اس نیم جاں اقلیت پر صرف کر رہی ہے جو مسلمان کہی جاتی ہے۔

فرض کیجئے جے پی کی تحریک کامیاب ہوتی ہے آپ ہی بتائیے اس میں آپ کا اور

اقلیت کا کوئی مقام ہوگا۔ جے پرکاش نرائن کے مسلمان گماشتوں سے پوچھ کر اس کا جواب دیجئے گا۔ عام مسلمانوں کا رُخ۔ جے پی تحریک کی طرف اس لئے نہیں ہے کہ بہار میں اتفاقاً کانگریس کی اندرونی و بیرونی بددیانتیوں نے کانگریس کو ایک ایماندار مسلمان کی وزارت اعلیٰ کی کرسی پر متمکن ہونے کے لئے مجبور کر دیا۔

مسلمان شاید دنیا کی سب سے زیادہ جذباتی قوم ہے۔ جے پی تحریک کا مقابلہ اگر کسی دوسرے چیف منسٹر سے ہوتا تو عام مسلمانوں کا فیصلہ بالکل مختلف ہوتا۔ لیکن مقابلہ عبدالغفور صاحب سے ہے جن کا پہلا جرم ہے مسلمان ہونا اور دوسرا ایمانداری، دیانت اور عدل و انصاف ہے۔ اگر عبدالغفور صاحب سدِ سکندری بن کر ان کی راہ میں نہ کھڑے ہوتے تو اقلیت کے زورِ بازو کے سہارے جے پی تحریک مسلمانوں کے تنِ بسمل کی قیمت پر بہار کی حکومت بنا چکی ہوتی۔ مگر اب تک اس تحریک کو وہ سپاہی نہیں ملا جو صرف ماؤں کی گود میں پروان چڑھتے ہیں۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا مسلمانوں کو مذہبی اقلیت سمجھ کر لکھا گیا۔ مگر جو مسلم قیادت آج کل جے پی تحریک کو مسلم حمایت کی یقین دہانی میں بہار کے طول و عرض کا دورہ کر رہی ہے مسلمانوں کو مذہبی اقلیت کی حیثیت سے کبھی تسلیم کرتی تھی یا نہیں؟

لے دے کر اردو کا سالانہ ہنگامہ اجتماع اردو کے حقوق پر گریہ پیہم اس کا کارنامہ ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اردو زبان ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور مختلف باشندگانِ ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ اردو کے خادم کی حیثیت سے راقم الحروف اس لسانی اقلیت کا ایک فرد ہے جس کے افراد جناب خوشتر گرامی، آنند نرائن ملاؔ، رنبیر ملاپ وغیرہ ہزاروں لاکھوں غیر مسلم ہیں۔ اگر اردو کا مسئلہ حل ہو بھی گیا، اگر اردو کے مطالبات تسلیم بھی کر لئے گئے تو اردو لسانی اقلیت کو فائدہ پہنچے گا جس میں مسلمانوں کی ایک موثر تعداد موجود ہے۔ مگر مذہبی اقلیت ریلیجس مائنوریٹی کی حیثیت سے اس مسلم قیادت نے کیا کیا جو جے پی کے پلیٹ

فارم سے بیزار اور مبصر ہونے کا اعلان کرتی ہے اور عام مسلمانوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہے کہ مسلمانانِ بہار کی واحد نمائندگی کا حق صرف اس کو حاصل ہے۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکہ نظر آتا ہے
پردہ پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے

خالص اقلیتی پلیٹ فارم سے ایک دو مرتبہ نہیں ہزاروں مرتبہ اس قیادت کو آواز دی گئی مسلم لیگ مسلم مجلس وغیرہ لیکن اس قیادت نے ہمیشہ اردو کی چار دیواری تک اپنی ذات کو محدود رکھا، کیوں؟ اس لئے کہ لسانی اقلیت بن کر مذہبی اقلیت کے طعنہ سے محفوظ رہ گئے۔ پھر وہاں آنند نرائن ملاؔ، خوشتر گرامی درجنوں ہندو موجود ہیں جو خالص قوم پرستی کا سرٹیفکیٹ دے دیں۔ اس کے علاوہ جب مسلم اقلیت جماعتی تنظیم کے ساتھ آئے گی تو افراد و اشخاص پیچھے ہوں گے، جماعت آگے ہوگی۔ یہ چیز قیادتِ موصوفہ کے مزاج کے خلاف بھی ہے اور امریکن ڈالر پالیٹکس کے رموز و نکات کے منافی بھی۔ جو لوگ صرف اردو کو مسلمانوں کے سارے دکھ درد کا علاج سمجھتے ہیں اور ملک میں صرف لسانی اقلیت بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ اردو کے مایہ ناز شاعر پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کے اشعار ہی بچوں کو پڑھا دیئے جائیں تو اقلیتی کردار کا عطر خلاصہ ہو جائے۔

اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

اور ملاحظہ فرمائیے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترکیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

فرمائیے ''حیات بعد الموت'' حشر و نشر روح ساری باتوں کا قلع قمع ہو گیا۔

اگر مسلم اقلیتی کردار میں مذہبی عقائد و خیالات و جذبات و افکار بھی داخل ہیں تو

لسانی اقلیت بن کر اور مذہبی اقلیت کے نام سے عدم علیحدگی کا ارتکاب کرنے کے بعد آپ بستے کہاں ہیں؟

عقائد و خیالات پر ہی منحصر نہیں اہل قلم، شاعر، ادیب، انشاء پرداز صحافی غیر مسلموں میں آج بھی موثر تعداد میں موجود ہیں۔ انہیں اردو سے محبت بھی ہے۔ اگر آج اردو معاشی اور اقتصادی طور پر اپنا مقام حاصل کر لے تو انہیں کے بچوں سے آپ کا مقابلہ ہوگا اور آپ کے بچے ان ہندوزادہ بچوں کے مقابلہ میں کمترین ثابت ہوں گے۔

اردو کے نام پر ساری اقتصادی مراعات کے اوّلین مستحق وہی قرار پائیں گے اور میں نے دہلی میں دیکھا کہ اس کے روشن امکانات موجود ہیں۔ لہٰذا مذہبی اقلیت کی حیثیت سے آپ اپنے خطوطِ امتیاز کے تحفظ کے لئے آمادۂ عمل رہیں۔ کسی پتر کار، کسی صحافی کو کسی طرح جانے کا اختیار ہے، اس کی راہ نہیں روکی جا سکتی مگر آپ جے پی گروپ سے پوچھیں تو سہی کہ لسانی اقلیت کی حیثیت سے ہمارا وجود آپ کو آپ کی ساختہ پرداختہ جماعتوں کو تسلیم ہے۔ اگر ہے تو اس کا اعلان برسرِ اجلاس کیوں نہیں ہوتا؟ اخبارات میں اس کے متعلق کوئی بیان آج تک شائع کیوں نہیں ہوا؟

پھر مذہبی اقلیت کی حیثیت سے اپنے وجود کو تسلیم کرانا بھی اسی مرحلہ میں ضروری ہے۔ ورنہ تحریک جب آگے نکل گئی تو آپ سر پیٹتے رہ جائیں گے۔ اس تحریک کے جتنے نقصانات ہیں آپ کے حصے میں آئیں گے اور سارے فوائد و منافع کے مالک و مختار دوسرے ہوں گے۔

اس تحریک کا خطرناک پہلو اور بھی ہے کہ ملک میں پھیلائی جانے والی بدنظمی اور انتشار کا مقابلہ کرتے ہوئے اگر جمہوریت کا سورج ڈھلنے لگا تو فوج کے سائے کچھ اور لمبے ہو جائیں گے۔ اگر یہ انقلاب جمہوریت بالکل غروب ہو گیا تو ملک میں فوجی حکومت کی شام اپنی روایتی خون آلود رعنائیوں کے ساتھ آکر مسلم مذہبی اقلیت گڈ ایوننگ کہتے ہوئے

مزاج پرسی کا آغاز کردے گی۔

پھر فوجی حکومت کا زمانہ شب تاریک ہجراں سے زیادہ دراز ہوگا۔ آئینی دستوری تحفظات کی دو چار دفعات رسماً ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر موجود ہیں یک قلم منسوخ و کالعدم ہوں گی۔ اکثریت اس بھیانک رات میں بھی برقی قمقمے روشن کرے گی اور مسلم مذہبی اقلیت کو صرف صحیح مستقبل کی امیدوں کا خواب بستر پر تھپکیاں دے کر سلا دے گا۔ لیکن فوجی حکومت کی مدتِ دراز کے بعد اگر کوئی جمہوری دستوری حکومت ملک میں آئی تو جن سنگھ کے خیالات اقلیت کش خیالات کی سرگرمِ عمل نمائندہ ہوگی۔

اس وقت کوئی معجزہ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو خطرات و مہلکات سے بچا سکے گا۔ اس لئے اس کی تدبیر آج کرنی ہے۔ آنے والا کل ہمارے اچھے برے اعمال کا نتیجہ ہوگا اور بس۔

وہ قوم نہیں مستحق عظمتِ فردا
جس قوم کی تدبیر میں امروز نہیں ہے

کیوں؟ کیا یہ سوال نہیں ہے؟ ہے اور بہت اہم ہے اس کا جواب ہر سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جانے والے مسلم پترکار سے نہ پوچھئے جن کا دعویٰ ہے کہ:

کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
قیس کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

ڈاکٹر عابد حسین کی قابل قدر کتاب ہندوستانی مسلمان ''آئینہ ایام'' میں سامنے رکھئے۔ ڈاکٹر صاحب صفحہ ۲۲۹ پر کتاب کے دسویں باب کا افتتاح اس جملہ سے کرتے ہیں۔ ''ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ان کے سیاسی اور ذہنی رجحانات پر جو ان میں پائے جاتے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے فکر و عمل پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہے۔ جمود کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ملک کا

سیاسی نظام بدل گیا ہے اور معاشی نظام آہستہ آہستہ مگر محسوس طور پر بدل رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے اندازِ فکر میں کوئی تبدیلی نہیں......۔"

ان میں اتنی قوتِ حیات، اتنی اُپج، اتنی خود اعتمادی نہیں کہ ایک پرزور تحریک کی صورت میں آگے بڑھیں۔ آگے چل کر عابد حسین لکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ذہنی اور تہذیبی انحطاط کا ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بڑا سبب یہی تھا کہ وہ ایک بڑی عالمی تہذیب کے وارث ہونے کے غرور میں نئی عالمی تہذیب کو ایک مدت تک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے اور کوشش نہیں کی کہ اس کا مطالعہ کریں اور اس سے علمی تحقیق، صنعتی تکنیک اور سیاسی تنظیم کے نئے گر سیکھ کر اپنی زندگی میں تازگی اور روانی پیدا کریں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقہ کی لاأبالیت حالات سے بے پروائی غفلت اور عافیت کوشی پر ماتم سرائی کا فرض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب پھر لکھتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ بنیادی سوال ہے جو فوری جواب چاہتا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی زندگی کے چشمے کو انسانی زندگی کے بڑے دریا سے جو جدید تہذیب کہلاتا ہے کاٹ دینا چاہتے ہیں یا اس سے اپنا رِشتہ استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ شعوری اور ارادی طور پر موخر الذکر صورت کو ترجیح دیتے ہیں ان سے مجھے کوئی پرخاش نہیں مگر جو لوگ غیر ارادی طور پر غیر شعوری انداز میں اوّل الذکر کی صورت والوں کی ہے تو مجھے یقیناً تکلیف ہوتی ہے اور دل کی چوٹیں اُبھر کر کبھی کبھی صفحہ قرطاس پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اخلاقی جمہوریت

اخلاقی جمہوریت کی روح عضوی جمہوریت ہے۔

با طفل کم سواد سبق قصہ ہائے دوست
صد بار گفتہ و دگر از سر گرفتہ ایم

جذبۂ بے اختیار کا سیاسی واصطلاحی نام ہے جس کے تحت انسان یہ اعلان کرتا ہے کہ:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

سارے جہاں کا درد تو بڑوں کی باتیں ہیں مگر چھوٹے سے چھوٹا پیمانہ فکر بھی ساری قوم کا درد سارے ملک کا درد اپنا سرمایۂ حیات نہ سمجھے تو اس کا وجود انسانیت کے لئے پیغامِ ماتم ہے۔ یہ چیز مفروضہ نہیں بلکہ مسلمات کا درجہ رکھتی ہے کہ فلسفہ اخلاق کے خادموں، نوکروں اور غلاموں کی ہے۔

اخلاقی جمہوریت اس اصول کو اپنا دین وایمان سمجھتی ہے۔ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر جو قوانین بنائے گئے، جو احکام جاری کئے گئے تاریخ کے وسیع اور عمیق تجربات نے ان کی ناکامیوں کی حسرتناک داستانیں دنیا کو سنائی ہیں۔ دنیا کو سورج، روشنی، ہوا، پانی، غذا اور دوسرے اسبابِ زندگی کی طرح فلسفۂ اخلاق کی ضرورت ہے۔

تہذیب شائستگی، آدمیت کے بغیر کوئی حکومت، کوئی قوم، کوئی ملک زیادہ دیر تک زندگی کے اسٹیج پر اپنا کھیل نہیں دکھا سکتا۔ بائبل کے اوراق نے دنیا کو یہ بتایا تھا کہ خداوند خدا زمین پر اپنے نیک مزاج بندوں کو حکومت اور طاقت عطا کرے گا۔ انہیں سرسبز و شاداب بنائے گا لیکن شریروں کے خیمے اُکھاڑ دیئے جائیں گے۔ تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی صالحین کی وراثتِ ارضی کا اعلان کیا ہے۔ گیتا میں بھی جس دھرم کی توہین پر کرشن جی نے مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کی چیتاؤنی دی ہے۔ اس سے مراد یہی فلسفۂ اخلاق اور اس سے غیر متبدّل بنیادی اصول ہیں۔

انگریزوں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ جمہوریت کے سب سے بڑے مدعی اور نقیب انگریز ہیں لیکن ان کے پاس دستور موجود نہیں، صرف رسم و رواج کی بنیاد پر محدود شہنشاہیت کے زیر سایہ کاروبار چل رہا ہے۔ ہندوستان میں جس وقت دستور سازی کی منزل سامنے آئی، انگریز کوئی نشانِ قوم نہ دے سکے۔ امریکہ اپنے دستوری اُمور میں ساری دنیا سے مختلف ہے۔ روس کو جمہوریت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس کے نظریہ اشتراکیت مذہب ہی نہیں بلکہ انسانیت کے بنیادی اخلاق کا بدترین معاند، بدترین دشمن اور مخالف ہے۔ روس سے ہندوستان کے دستور ساز دماغ کو کیا روشنی ملتی؟ نتیجہ بے آب و رنگ جمہوریت اور اخلاق سے عاری یا بے بنیاد جمہوریت کی شکل میں کاغذی پیرہن پہن کر نمودار ہو گیا۔ دستور ساز اسمبلی کی شوخیٔ تحریر نے ہر نقش کو نقش دنیاوی بنا کر رکھ دیا۔ آج ہر پیکر پیکرِ تصویر ہے جس کو سرِ بازار جلا کر خاکستر کیا جا رہا ہے۔ پھولوں کی ہنسی بھی آنسو گیس کے بے تحاشا استعمال سے گریہ شبنم بن چکی ہے۔ حکومت اور عوام دونوں اپنے اپنے طرزِ عمل کی حمایت میں دلائل کا دفتر لئے پھر رہے ہیں اور فلسفۂ اخلاق اپنے دونوں باغیوں کو یکساں طور پر سزا دے رہا ہے۔

دہر میں رازِ بقا آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ ساحل بن گئیں

اگر آگے بڑھنا ہے تو پیچھے ہٹنا اب تلخ تجربات کی روشنی میں مجبوری بن چکا ہے۔ گویا ملک کو خانہ جنگی کی آگ سے بچانا ہے تو اپنی جمہوریت کو اخلاقی سطح مہیا کرنی ہوگی۔ جس جمہوریت کی بنیاد اخلاق پر نہیں، بے بنیاد جمہوریت ہے، ہوا میں معلّق رہے گی اور اپنے ماننے والوں کو بھی ہوا میں معلّق رکھے گی۔ ہوا کا ہر جھونکا اسے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف منتقل کرتا رہے گا۔ دستور میں ترمیم کی نزاکتوں کا اندازہ کئے بغیر کوئی قدم اٹھا دینا حد درجہ خطرناک ہے۔ میر تقی میرؔ مرحوم کے اس شعر کو رہنما اصول کے طور پر سامنے رکھئے:

لے سانس بھی آہستہ کے نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

جس وقت آپ اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنی جمہوریت کی بنیاد و اساس قرار دیں گے اسی وقت سزا یافتہ غنڈے شہر اور دیہات کے جانے پہچانے لچے شہدے لازماً حقِ رائے دہی سے محروم ہو جائیں گے۔ مگر ان کے دوسرے حقوقِ شہریت بدستور محفوظ ہوں گے مگر ووٹ دینے، ممبرِ اسمبلی بننے اور وزارت کی کرسیوں پر ساری شرارتوں بدمعاشیوں اور غنڈہ گردیوں کے ساتھ قبضہ کرنے کا پیدائشی حق ہوا میں گرد و غبار بن کر اُڑ جائے گا۔ صحیح صالح اور صحت مند اخلاقی معاشرہ حکومت بنائے گا۔ اراکینِ حکومت کو منتخب کرے گا، شرارت پسند غنڈے ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی صرف تماشائی ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ چشمِ عبرت کے لئے ایک تماشہ ہوں گے۔ اخلاقی جمہوریت ان کی غذا، تعلیم، لباس، مکان، ملازمت اور کاروبار کا انتظام بہر حال کرے گی۔ لیکن اُنہیں رائے دہی یا حکومت سازی سے اصولاً بے دخل کردے گی۔

مسٹر اولڈھم سیلابِ عظیم اور خانساماں جی

لوگ اُنہیں خانساماں جی کہتے تھے۔ نام کسی کو معلوم نہ تھا اور معلوم کیوں کر ہو۔ لفظ خانساماں جی میں جو انگریز مسٹر اولڈھم کلکٹر کی حاکمانہ شان کا تصوّر پیدا ہوتا تھا۔ وہ بات ماں باپ کے رکھے نام میں کیونکر پیدا ہوتی۔ خانساماں جی مسٹر اولڈھم سے منسلک تھے۔ مسٹر اولڈھم بہت بڑے انگریز، بہت بڑے کلکٹر، اردو ہندی لفظوں میں ڈکشنری کے مولف و مرتب اور خانساماں جی کے عقیدتمندانہ تصوّر کے مطابق بڑے روشن ضمیر بھی تھے۔ راقم الحروف کو مسٹر اولڈھم کے انگریز ہونے اور بہت بڑے انگریز ہونے سے تکدر کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ مسٹر اولڈھم بہت بڑے کلکٹر، بہت بڑے کمشنر، بہت بڑے گورنر سبھی کو تسلیم تھا مگر روشن ضمیری کا معاملہ ذرا پیچیدہ تھا۔ راقم الحروف ذرا خلافتی قسم کا کانگریسی تھا۔ گاندھی جی کے چرخہ کو چرخِ کج کلاہ کی طرح فیصلہ کن طاقت سمجھنے والوں، لنکا شائر اور مانچسٹر کے سوتی مزدوروں کو چرخہ گھما کر ہندوستان کی تحریک آزادی شروع کرنے پر مجبور کردینے والا مردِ مجاہد ''علی'' کا معتقد حسرت موہانی کا طرفدار، ظفر علی خاں آف زمیندار لاہور کا حامی، مہر و سالک اور ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' کو پرچم ہلال کا ہے قومی نشان ہمارا قرار دے کر چودہویں رات کے چاند کی بڑھیا کو چرخہ کاتنے دینے والا سڑکوں زیب چندومیاں کی مسجد چودھرانہ آرہ اور ستار میاں خلافتی اور ان کے ساتھ ہزاروں کے جلوس میں:

راجندر پرشاد کہیں اور مولوی شفیع وکیل
دیش کے سر منڈلاتی ہے دیکھو یہ کیسی چیل

بھائی چرخہ کاتو چرخہ بہنو چرخہ کاتو چرخہ گاتے ہوئے گذر جانے والے خادمِ وطن کے مسٹر اولڈھم کی تعریف و توصیف ہی عدم تشدد اور اہنسا کا ثبوت تھا۔ مگر خانساماں جی انتہائی سادگی کے ساتھ ''صاحب'' کی روشن ضمیری کو حلق سے اُتار دینا چاہتے تھے۔

یہ واقعہ آرہ کا ہے۔ راقم الحروف نے نصف صدی کی مدت بحیثیت باشندۂ شہر گذاری ہے۔ واقف عظیم آبادی کے ٹکرا سے دھوکہ نہ کھائیے۔ یہ لفظ صرف وطنِ اقامت کی نشاندہی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ خانساماں جی بھی آرہ ہی کے باشندہ تھے۔ آرہ میں تحریک آزادی کے فوراً بعد سیلابِ عظیم آیا تھا۔ گوپالی کنواں آرہ کے چوک پر کشتی چل رہی تھی۔ موجودہ شمالی بہار کا سیلاب اپنی تباہ کاریوں کے باوجود آرہ کے سیلابِ عظیم کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

جب سیلاب ختم ہوا تو انگلستان سے خانساماں جی کے نام مسٹر اولڈھم کی چٹھی آئی جس میں لکھا ہوا تھا کہ اخبارات سے آرہ کے سیلاب کی خبر ہوئی مگر یقین ہے تم خیریت سے ہوگے۔ سیلاب کی تباہ کاریوں سے دل بہت مغموم ہے مگر اس کی خوشی بھی ہے کہ اگلے سال کھیتوں میں پیداوار بھی اچھی ہوگی۔

خدا صرف چند مہینوں کے فاصلہ سے ہر نقصان کی تلافی کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ سزا کے بعد انعام دینا بھی اس کی فطرت ہے۔ اگلے سال فصل سچ مچ بہت اچھی ہوئی۔ کھیتوں میں سیلاب کی وجہ سے نئی مٹی کی زرخیز تہہ جم گئی تھی۔

خانساماں جی کو ان باتوں سے کیا مطلب۔ اپنی جیب سے خط نکال کر لوگوں کو دکھا دیتے تھے اور پوچھتے تھے کہ اولڈھم صاحب کو کیونکر معلوم ہو گیا کہ میں خیریت سے ہوں۔ انہیں کیونکر معلوم ہو گیا کہ اگلے سال فصل بہت اچھی ہوگی، کیا روشن ضمیروں کے سر پر سینگ ہوتی ہے؟ اولڈھم صاحب روشن ضمیر ہیں اور بیچ کھیت روشن ضمیر ہیں کوئی مانے یا نہ مانے شمالی بہار کے سیلاب کی تباہ کاریوں سے راقم الحروف کا دل بھی اسی طرح مغموم ہے جس

طرح اولڈھم صاحب کا دل آرہ کے سیلاب پر مغموم تھا۔ خانساماں جی کا واقعہ سیلاب کے سلسلہ میں یاد آ گیا اور مبارک عظیم آبادی کا وہ شعر بھی:

یہ غم کدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

سیلاب کی تباہ کاریاں سب کے لئے یکساں ہیں۔ اندرائی، جئے پرکاشی، غفوری، سروری سب اس رو میں بہہ گئے۔ منسٹروں کا تو فرض ہی تباہ شدہ علاقوں میں جا کر ڈوبی ہوئی غرقاب زمین کے نیم جان انسانوں کو دیکھنا، پٹنہ واپس آ کر اخبارات میں اپنی تصویروں کے ساتھ نمایاں ہونا، پبلسٹی دینے والے اخبارات کو اظہارِ خوشنودی کے طور پر بند لفافہ میں نوٹوں کی معقول تعداد پیش کرنا، مقامی افسران سیلاب زدہ کو اپنے قیمتی مشورہ کے گوہرِ نایاب سے سرفراز فرمانا ہے۔ لیکن بابو جئے پرکاش نارائن اور ان کے سنگھرشیوں کو تو ان جھگڑوں سے فراغت ہے۔ ریلیف کا کام کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرنا شریفانہ کام ہے اور جس سے اپوزیشن لیڈروں کو سخت نفرت ہے۔

ہڑبونگ سبھا میں دلچسپی، جاذبیت اور مقناطیسی کشش ہے۔ امتحانات کی بندش میں قتل کا ارتکاب کر جانے میں جو لطف ہے، جو مزہ ہے، ریلیف کے سیدھے سادے کام میں کہاں؟

ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہو اور حکومت پر نکتہ چینی کرتے جاؤ کہ یہ نہیں ہوا وہ نہیں ہوا۔ یہ ہے اپوزیشن لیڈری کا اصول زندگی۔ بابو جے پرکاش نرائن بھی جانتے ہیں کہ غیر معمولی حالات میں اپوزیشن کہیں کسی ملک میں حکمراں پارٹی کے ساتھ عدم تعاون نہیں کرتا۔

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کا پیغامِ محبت

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کا استقبال سر آنکھوں پر۔ مگر ادھر دیکھئے ستم کی فوج کھڑی ہے پر جمائے ہوئے۔ جو حکومت اعلیٰ اخلاقی قدروں کی محافظ نہیں، زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ جو قوم اپنے پہلو میں انسانیت کا درد بھرا دل نہیں رکھتی ملک کے جغرافیہ میں خانہ جنگی کا آب و رنگ بھر دے گی۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء اس افسانہ کی سرخی ہے جو نوجوانانِ بھارت کے خون سے لکھا جانے والا ہے۔ بابو جے پرکاش نرائن اس کو سنگھرش کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ اسی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے مدتوں پہلے اس کو جدلی مادّیت کہہ کر اپنی اصطلاح بازی کا رعب طاری کر دیا ہے۔

کانگریس، گاندھی جی کے اہنسا کو اسی طرح سینہ سے لگائے بیٹھی ہے جس طرح عیسائی دُنیا حضرت مسیح علیہ السلام کی اخلاقی تعلیمات کو دل کی گہرائیوں میں دفن کر چکی ہے۔ عملی زندگی میں ٹٹ فار ٹیٹ، اینٹ کا جواب پتھر مسیحیوں کا اصول بھی ہے اور کانگریس کے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل کا مسلک بھی۔ بابو جے پرکاش نرائن کے سنگھرشی نقارہ پر چوٹ پڑ چکی ہے۔

ز نقارہ آواز آمد بروں
کہ دون است دون است گردونِ دوں

ہر طرف وقت کی بساط پر بچھائے ہوئے مہرے اپنا اپنا فرض انجام دے رہے ہیں مگر فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ۔ ہمارے سامنے راستے صرف دو ہیں۔ عمل

سے زندگی کو جنت یا جہنم بنانے کا فلسفہ، کیوں کہ کوئی خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔ یا پھر تھکے ہوئے بازوؤں کی مناجات کا راستہ بارگاہِ الٰہی میں:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

وہ نادان جو اس وقت سجدہ میں گر پڑتے ہیں جب وقتِ قیام آتا ہے اپنی محرابِ مسجد کو خود بخود کسی شوخ کے مصرعہ کا تختۂ مشق بناتے ہیں۔

آیئے دومنٹ، صرف دومنٹ حیاتِ مستعار سے مانگ کر حالات پر غور کریں اور خدا سے عملی زندگی کی رہنمائی طلب کریں جس کو شاید اپنے بندوں سے یہ شکایت ہے کہ:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں

یہ سچ ہے کہ کوئی لطیف جذبہ ہو الفاظ کے قالب میں آ کر اپنی اصلی روح سے محروم ہو جاتا ہے۔ بیانِ دردِ محبت کے معاملہ میں بڑے اہلِ زبان اعتراف کر چکے ہیں:

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زیاں کے لئے

اس لئے محبت کی فلسفیانہ تعریف مولانا عبدالماجد دریابادی سے پوچھئے۔ مجھ سے صرف اتنا سن لیجئے کہ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ ابھی نصف صدی کی مدت بھی نہیں گزری جب گھر گھر محبت کی بانسری بج رہی تھی۔ علم کا معیار پریم کے ڈھائی اچھر تھے۔ اس کو پڑھنے والے پنڈت اور علامۂ دوراں سمجھے جاتے تھے۔ صرف کتابوں کا بارِ گراں اپنی پشت پر رکھ کر کوئی شخص معاشرہ میں مشرف بہ انسانیت بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم یافتہ محقق اور دانشمند ہونا تو بڑی بات ہے۔

نہ محقق بود نہ دانشمند
چار پائے برو کتابے چند

صوفیائے خانقاہ جادۂ محبت کے مالک تھے۔ طریقت مسلکِ محبت کا اصطلاحی نام تھا۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

یہاں شریعت کی پابندیوں سے زیادہ جذبہ محبت کی لغزشِ مستانہ قابل پذیرائی تھی۔

شروع راہِ محبت وہیں سے ہوتی ہے

جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگائے ہوئے

پیر رومی کی مثنوی ہست قرآن ور زبان پہلوی کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنے اوراق معرفت میں خدا کا یہ وجد آفریں پیغام اس طرح سنا رہی تھی:

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم

ہر کسے را اصطلاحِ دردہ ایم

ہندیاں را اصطلاحِ ہند مدح

ہندیاں را اصطلاحِ ہند مدح

موسیاں آداب دانا دیگرند

سوختہ جاں در دانائی دیگرند

ہندو مسلم اتحاد کا خواب آج اپنی کثرتِ تعبیر سے پریشان ہے۔ لیکن صبح بنارس کبھی شیخ علی حزیں کی مطلعِ آفتاب بھی دیکھ چکی ہے۔

گرمیٔ عشق بہ و پرانہ و آباد یکیست

حسن چوں تیغ کشد بندہ و آزاد یکیست

صرف صبح بنارس نہیں وہاں کی رات بھی حزیں کے اس سنگِ چقماق سے اپنے سجدوں اور بتکدوں کے بجھے ہوئے چراغ روشن کر چکی ہے۔

عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر

پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

لکھنو کا صوفی اور عالم دین اور مسلم الثبوت شاعر اپنا مسلکِ زندگی اس طرح بیان کرتا ہے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

نہ تڑپنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مفتی امیر احمد مینائی علیہ الرحمۃ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حدیث نبوی ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر مہربان نہیں ہے۔ اس حدیثِ شریف کا ترجمہ مسدس حالؔی میں اپنے موثر اندازِ بیان میں زینتِ مسدس بنایا۔

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس جگر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

صاحبِ دل کی پہچان ہی صوفیوں نے رکھی۔ انسانیت کے درد میں ڈوبا ہوا دل اور بس:

لیلائے غمِ عشق کا محمل نہ سمجھنا
جس دل میں نہ ہو درد اسے دل نہ سمجھنا

ہزار روز بہ روزہ ہزار شب بہ نماز
قبول نیست اگر خاطرِ بیازاری

یعنی ہزار روزے رکھے، ہزار راتیں نماز میں بسر ہوئیں مگر کسی کا دل اگر دکھا دیا تو بارگاہِ الٰہی میں یہ روزے اور نمازیں قبولیت کا شرف حاصل نہیں کرسکتا۔ یعنی سنت رسول کی پیروی کا مفہوم تھا دلجوئی۔

ذوق رکھ سنتِ گرامی سے
ہے شرف آپ کی غلامی سے

جو کوئی پیروِ رسول نہیں
لاکھ طاعت کرے قبول نہیں

یہ تھی وہ اعلیٰ تعلیم جس نے ہمیں انسانوں کی طرح جینا سکھایا تھا۔

مولانائے روم کا یہ شعر ہندو مسلمان دونوں کی زبانوں پر زینتِ سخن تھا۔

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دلِ بہتر است

ہزاروں کعبہ سے ایک دل بہتر ہے۔ دوسروں کا دل ہاتھوں میں لو کہ یہ حجِ اکبر کا ثواب رکھتا ہے۔ دل آزاری سب سے بڑا گناہ ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ دلجوئی کے سب سے بڑے مبلغ اور دل آزاری کے خلاف سب سے بڑے مجاہد بن کر شاعری جزولیست از پیغمبری کا معجز نما فرض انجام دے رہے تھے:

حافظا مصحف بسوز د آتش اندر کعبہ زن
ساکن، بتخانہ باش و مردم آزاوی مکن

اے حافظ قرآن کو جلادو۔ کعبہ میں آگ لگا دو، بتخانہ میں سکونت اختیار کرلو سب کچھ کرو مگر مردم آزاری نہ کرو۔

میر انیس مرحوم کے اشعار زبانوں پر نہیں دلوں پر حکومت کر رہے تھے:

انیس عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابو تراب نہ تھا

خاکساری نے عطا کیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمین سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہردم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

شاعرانہ زندگی منکرِ مئے بودن و ہمرنگِ مستان زیستن کی آئینہ دارِ جمال تھی۔ رندانہ لا اُبالیت کے ساتھ درویشی اور تصوف کے نکتہ ہائے اخلاق کی تبلیغ و اشاعت شعراءِ کرام جس طرح کر رہے تھے کہ احسان ناشناسی کے جذبہ کو الفاظ نہیں ملتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس زبان سے ان کا شکریہ کلام ادا کیا جائے۔

اکبرالٰہ آبادی مرحوم انگریزیت اور مغربیت کے سب سے بڑے مخالف اس لئے تھے کہ روح اخلاق اگر قوم کے قالبِ خاکی سے نکل گئی تو انسانیت قیامت تک بیٹھ کر انجمنِ اغیار میں چراغِ آرزو جلاتی رہیں گی اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

حضرتِ شیخ کا کہنا مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اکبرالٰہ آبادی دلوں کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں:

دلوں کا قرب حاصل کیجئے راحت رساں ہو کر
نفس کے سینہ میں جا پائی ہے آرامِ جاں ہو کر

اکبرالٰہ آبادی بھی ظاہری نقش و نگار کو بے معنی سمجھتے ہیں اگر یہ دل آراستہ نہیں۔ کسی مشہور ایرانی شاعر کا یہ شعر ان کے دل کی آواز بن کر ان کے اشعار کے سینہ میں نفس کی آمد و شد کا زیر و بم پیدا کرتا تھا۔ اکبر مرحوم جب اس شعر کو پڑھتے تھے ایک عجیب عالمِ وجد و کیف میں آجاتے تھے۔

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی است
ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا اینجا است

دہلی کی بیٹی اور متھرا کی گائے

مولانا فارقلیط مرحوم نے ''نئی دنیا'' ہفتہ وار دہلی میں لڑکیوں کی شادی جہیز وغیرہ کے مسئلہ پر مڈل کلاس مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ بہت موثر انداز میں کھینچا ہے۔ مضمون اتنا شاندار اور جاندار ہے کہ پڑھنے کے بعد نگاہوں سے حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ مگر خاتمہ بالکل ''اڑا اڑا دھم'' ہے۔ علاج بتانے سے مولانا فارقلیط نے دانستہ گریز کیا اور ایک ایک مرض کی سو سو نشاندہی کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ناظرین کی عاقبت پر اُتار دیا۔

ایک زمانہ تھا جب بہار کے مڈل کلاس شریف گھرانوں میں یہ مثل سنی جاتی تھی کہ دہلی کی بیٹی اور متھرا کی گائے کرم پھوٹے تو باہر جائے۔ دہلی والے ابتدا ہی سے لڑکیوں کی شادی کے مسئلہ کو اپنے خودساختہ اصولوں سے حل کرتے آرہے ہیں۔ مسدس حالی میں:

یہی جھینکنا کو بہ کو گھر بہ گھر ہے
بہو کو ٹھکانہ نہ بیٹی کو بر ہے

لکھ کر قدیم دہلی کی سو فیصدی ترجمانی کی گئی ہے۔ دہلی کے مڈل کلاس شریف مسلم گھرانے اپنی خودساختہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اس لئے وہاں کشمکشِ حیات کی نوعیت سارے جہان سے جداگانہ ہے۔ ضرورت ہے کہ دہلی کی مڈل کلاس پیپلز کانفرنس طلب کی جائے اور اس میں ان کی مخصوص روایات کی برتری قائم رکھتے ہوئے معاشی اصولوں کی روشنی میں روابطِ باہمی کی پیوندکاری سے وہ صورت حال پیدا کر دی جائے کہ مرزا غالب مرحوم کی شکایت کو آسمان پر بھی شرم سے منہ چھپانا پڑے۔

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت

می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اس کانفرنس میں ہفتہ وار اتحادِ وطن کو اس کے ایڈیٹوریل اسٹاف کو اس کے محترم ایڈیٹر مولانا امین اعجازی کو سگریٹ اور اس کے دھوئیں کے ساتھ مدعو کیا جائے جن کا قالب پٹنہ میں ہے اور روح دہلی کے سیاسی مرغزاروں میں۔

اگر اس دہلی مسلم مڈل کلاس پیپلز کانفرنس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بہار کے چیف منسٹر جناب عبدالغفور بھی مدعو کر لئے جائیں تو مولانا فارقلیط کو معلوم ہو جائے کہ ہر مسئلہ کا حل بے ایمان اور غیر ذمہ دار افسروں اور رہنماؤں کے تعطل اور اخراج میں پوشیدہ ہے۔

مولانا فارقلیط، مولانا عبدالوحید صدیقی اور جملہ ارکان ادارہ نئی دُنیا آگاہ ہو جائیں کہ حکومت کی دی ہوئی ساری مراعات جب چند مینو پلیٹ، چند اجارہ دار اپنے متعلق چاپلوسی، حاضر باشی، درباداری کی بنا پر گھسیٹ لیں تو مڈل کلاس لڑکیوں کی شادی کیونکر کرے، معیاری جہیز کہاں سے لائے۔ اچھے داماد کیونکر مہیا کرے؟ اسی کانفرنس میں دہلی مڈل کلاس پروٹیکشن لاء کی تجویز منظور کی جائے۔ مجلس قانون ساز میں اس کو دھوم دھام سے منظور کرایا جائے، جو لیڈر اس کے خلاف کچھ بولنا چاہے اس کو روس یا امریکہ کا ایجنٹ مشہور کر دیا جائے۔

آنجہانی ایم این رائے نے ''پرابلم آف مڈل کلاس'' ایک کتاب اسی عمر میں لکھی جس عمر میں مولانا فارقلیط اور ایس جہانی راقم الحروف مڈل کلاس کے مسئلہ پر سوچ رہے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی کہ مولانا فارقلیط سب کچھ لکھ کر آخر میں فرمادیں کہ لوگوں میں احساس پیدا ہو رہا ہے اور حالات میں خوشگوار تبدیلی کے آثار نمایاں ہیں۔

اپنا اصولِ حیات تو اقبال مرحوم کا یہ شعر ہے:

اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تمثیلِ گل

یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

مرزا بیدل اور قاضی عبدالودود

''معارف'' اعظم گڑھ اگست ۱۹۷۴ء میں مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کی جائے پیدائش کے مسئلہ پر قاضی عبدالودود صاحب کا یہ ارشاد شائع کیا گیا کہ نقل سے زیادہ عقل پر زور دینا چاہئے۔ گذارش ہے کہ عقل نام ہے علم کا۔ علم ہی کسی بات کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ عقل تو صرف قیاس آرائیاں کر سکتی ہے۔ مرزا غالب مرحوم کے لئے طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا قیامت تھا اور قاضی عبدالودود صاحب کے لئے بیدلؔ کی جائے پیدائش کا پتہ لگانا قیامت ہے۔ عافیت کوشی کا تقاضہ یہ ہے کہ ''خوشگو'' کے بیان پر اعتماد کر لیا جائے۔

قبلہ عالم مرزا بیدل مرحوم خود کو عظیم آبادی لکھتے ہیں۔ صاحبِ نظم ہی نہیں صاحب نثر بھی ہیں۔ اگر عظیم آباد ان کا وطنِ اقامت ہوتا تو صاف لکھتے کہ اکبر الہ آبادی مولد عظیم آباد نہیں ہو سکتا۔ یہ طریقہ علماء اور اسلاف میں رائج تھا۔ جب وہ صرف عظیم آبادی لکھتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ مولد و مسکن دونوں عظیم آباد ہیں۔ اس معاملہ میں شاہ عطا کاکوی کی رائے صحیح ہے۔ اگرچہ دلیل میں عقل و وزن موجود نہیں۔ بیدل عظیم آبادی عرصہ تک آرہ میں رہے۔ رانی ساگر میں ان کے پیر و مرشد شاہ اصغر علی صاحب کی خانقاہ تھی۔ بیدل خود لکھتے ہیں کہ بچپن اور عہدِ طفولیت کا زمانہ قصبہ آرہ اور موضع رانی ساگر میں بسر ہوا۔ بیدل عظیم آبادی کے پیر و مرشد کا غیر مطبوعہ دیوان راقم الحروف کے پاس موجود تھا جس کو قاضی عبدالودود صاحب کے چھوٹے بھائی قاضی محمد سعید صاحب مرحوم نے قیمتاً مجھ سے

حاصل کیا۔ اس میں شاہ اصغر علی صاحب کا قصیدہ منقبت حضرت مولانا علی مشکل کشا رضی اللہ عنہ کے متعلق موجود تھا۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں جنہیں بطورِ وظیفہ پڑھتا ہوں اگر آپ استفادہ کرنا چاہیں تو کر لیجیے:

گر دشمنے بہ پیشِ تو آید مکُن گریز
مردانہ باش و زود بخواں مرتضیٰ علی
دشمن گداز دوست نواز ست ذاتِ او
ابرِ بہار بادِ خزاں مرتضیٰ علی

سبحان اللہ و بحمدہٖ۔ یہ چند سطریں اس لئے لکھ دی گئیں کہ جناب قاضی عبدالودود صاحب کی نقل اور عقل دونوں کا منصفانہ موازنہ ہو جائے۔

مجھے دیوانِ غالب پسند آیا

بچپن میں مجھے مہتاب داغ اس لئے پسند تھی کہ سمجھ میں آتی تھی اور مولانا عبدالحلیم شرر کی کتابیں اس لئے پسند آتی تھیں کہ سمجھ کر پڑھنے میں مزہ آتا تھا۔ مگر مولانا شرر کی کسی کتاب کو آج تک دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی:

کشیدہ ایم چناں ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیرِ مئے فروش نماند

اور مہتاب داغ آج بھی دیکھتا ہوں اس لئے دیکھتا ہوں کہ ہر مرتبہ ایک نیا لطف آتا ہے۔ مہتاب داغ کے بعد اگر کوئی کتاب پسند آئی تو دیوانِ غالب ہے۔ آج بھی اس کا مطالعہ ذوق وشوق سے کرتا ہوں۔

کبھی غالب کی قادرالکلامی کو سامنے رکھ کر مطالعہ کیا جاتا ہے کہ سہلِ ممتنع کہنے پر آئے تو:

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

کہہ کر ذہن کا عطر خلاصہ کر لیا۔ چیستاں گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوگئی تو ہر پیکرِ تصویر کو پیرہن پہنا کر مطلعِ اوّل میں کھڑا کر دیا۔ تغزل اور مطالعہ بندی کی طرف آئے تو۔

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت مئے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

کہہ گئے۔ متعصّبانہ فلسفہ طرازی کا خیال آیا تو فرما گئے:

کثرتِ آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافرانِ اصنامِ خیالی نے مجھے

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

صحرائے فلسفہ کی خاک چھانتے ہوئے کبھی تاریخ کی وادیوں میں بھی قدم رنجہ فرما دیا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

جب جی چاہا کوچۂ تصوّف کی طرف جا نکلے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کبھی لا الٰہ میں اپنے وجود کی نفی کر دی اور کمالِ نیستی میں جھومتے ہوئے ارشاد فرما دیا:

آخر کیا ہے یہ تیری ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کبھی الا اللہ میں اپنے وجود کا عرفان ہوا تو فرمانے لگے:

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

کبھی معاملہ انحد کی آواز تک جا پہنچا اور سارے حجابات فوراً اٹھ گئے۔ مخطناہ سمیعاً بصیرا کی تجلی ہوئی تو مریدانِ سخن کو آگاہ فرمایا کہ:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کبھی چھٹے ہوئے رہ نوردانِ عشق کی بولی بولنے لگے:

مانگے ہے پھر کسیکو لبِ بام پر ہوس

زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

کبھی بیخودانِ بادۂ معرفت کی ترجمانی فرمادی۔ جنہیں جنت کی پرواہ بھی نہیں ہوتی۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

کبھی وہ آزادی اور خود بینی کہ سیدھے پھر آئے درِ کعبہ اگر وانہ ہوا اور کبھی خودداری کو بالائے طاق رکھا، فقیروں کا بھیس بنایا اور تماشائے اہلِ کرم دیکھنے لگے:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

کبھی مظاہرِ کائنات کی تحقیق و جستجو کا شوق پیدا ہوا تو سوال اُٹھایا کہ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے۔ کبھی فلسفہ سے شاعری کی طرف منتقل ہوئے تو کہہ دیا کہ:

جوش سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا

یاد آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

کبھی عشرتِ قطرہ کہتے ہوئے دریا میں فنا ہو گئے اور درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا کہہ کر آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر کھینچ دی تا کہ سو برس بعد مرزا غالب پر چادر چڑھانے والے ماضی پرست نہیں بلکہ حال کے تازہ ترین نمائندے قرار دیئے جائیں۔

کبھی دوسروں پر کوئی عاشقانہ آفت آئی تو ہمدم و دمساز بن کر نصیحت کرنے لگے کہ:

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی قابو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو!

کبھی راستے میں خود ٹھوکر کھا کر رونے لگے اور لوگوں کو اعتراض ہوا تو اعتراض کا جواب اس طرح دیا کہ وہ لاجواب ہو کر رہ گئے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

کبھی اپنے سازِ ہستی کے بے نوا ہو جانے کا غم ستانے لگا تو دنیا کو یہ کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی:

نغمہ ہائے شوق کو اے دل غنیمت جانئے
بینوا ہو جائے گا یہ رازِ ہستی ایک دن

کبھی دنیا کو اپنی طرف متوجہ پا کر اور اپنے اشعار کی بجنوری ٹائپ کی شرحوں کا خطرہ محسوس ہوا تو آنے والی نسلوں کو یہ کہہ کر اپنی صحیح پوزیشن سے آگاہ کر دیا۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

کبھی کاسٹ ازم کی طرف چل پڑے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعہ عزت نہیں مجھے

کبھی مزدور سبھائی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرہاد سے اپنا رشتۂ فکر جوڑ لیا:

پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

کبھی بورژوا ذہنیت کا اظہار استاد ذوق مرحوم پر اس چوٹ کی شکل میں ہوا۔

ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

کبھی سیاسی مصلحت اندیشی کا زور ہوا تو معذرت کر بیٹھے۔

استاد شہہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

کبھی عین حالتِ شراب نوشی میں ایمانیات کا جذبہ پیدا ہوا تو چیخ اُٹھے:

کل کے لئے کر آج نہ خشت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقئ کوثر کے باب میں

کبھی بندگی بوتراب میں مشغول ہو گئے:

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگئ بو تراب میں

کبھی سیکولرازم کو آنے والے ہندوستان کا سیاسی مذہب بنانے کا خیال آ گیا تو فرمانے لگے:

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کبھی دنیا کے سارے مذاہب کو اجزائے ایماں بنا کر اعلان کر دیا:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کبھی ملحدوں کی طرح جنت کو جنت الحمقاء قرار دے دیا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس طرح کے عقائد و خیالات سے واعظ کی برہمی وابستہ ازل ہے مگر اس کو زیادہ اہمیت دی جائے تو مناظرہ ٹھن جائے اور مناظرہ بازی سیکولر ذہن کے لئے سخت مضر ہے اس لئے یہ نکتہ ہمیشہ کے لئے ذہن نشیں کرادیا کہ کبھی اپنے اقوال کی بلندی اور اعمال کی پستی پر بھی نظر جا پڑی تو صاف کہہ دیا کہ:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو مجھے دیوانِ غالب اس طرح پسند آیا جس طرح غالبؔ کو تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا تھا۔

گرانی اور مہنگائی کا معمّہ

۱۹۴۳ء میں پنجاب میں یونینسٹ وزارت تھی۔ سر سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے گیہوں کی قیمت پانچ روپے من مقرر کردی۔ پنجاب میں ہی نہیں سارے منقسم ہندوستان میں اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا گیا۔ یہ احتجاج برائے احتجاج نہیں تھا اس کی معقول وجہ تھی۔ بنگال میں بھی چاول کی قیمت پانچ روپے من مقرر ہو گئی اور نتیجہ بنگال کا قحط تیس لاکھ آدمیوں کی فاقہ کشی سے موت۔

بنگال کے عوام پانچ روپیہ من چاول نہیں خرید سکتے تھے۔ ڈھائی روپیہ من سے یکا یک پانچ روپے من چاول کی قیمت ہو جائے اور تیس لاکھ آدمی نہ مر جائیں۔ بنگال میں قحط نہ آئے یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ پنجاب میں اب ڈیڑھ روپے کیلو گیہوں ہے اور بنگال میں راشن کی دکانوں پر چاول کا بھاؤ ڈھائی روپیہ کیلو ہے پھر بھی سب خیریت ہے۔ کانگریس بھی اپنی خرچیلی گورنمنٹ چلا رہی ہے، بابو جے پرکاش نرائن بھی اپنی خرچیلی تحریک چلا رہے ہیں۔ راقم الحروف بھی اپنا خرچیلا قلم چلا رہا ہے۔ آخر یہ کیا قصہ ہے؟ کہیں اسی کا نام تو انقلاب زندہ باد نہیں۔

آپ بھی سوچئے، روزنامہ ''ملاپ'' دہلی تو اس معمہ کو حل کرتے ہوئے گہری نیند سو گیا۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں جناب کیسری صدر بہار کانگریس سے ملاقات بات کرنی پڑے۔ مگر آپ کے لئے قوم کے لئے مادرِ وطن کے لاکھوں کروڑوں گراں مایہ بچوں کے لئے یہ ملاقات بھی گوارہ ہے۔

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا نہ کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

یہ زہریلے دودھ کے زہریلے مکھن

یہ کریم آف سوسائٹی ہیں۔ یہ بہت اونچے لوگ قوم کی اقتصادی خوشحالی اُنہیں دیکھ کر ہی سرسبز ہو جاتی ہے۔ حکومت کے فلاحی کاموں اور حکومتی پارٹی کے الیکشن فنڈ میں ایک کروڑ چندہ کی رقم پیش کرنے والے حکومت کے اعلیٰ سربراہوں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے والے اور ساری دنیا میں اسمگلنگ کے ذریعہ معاشی رابطہ کو فروغ دینے والے اُنہیں کون نہیں جانتا۔ بقول مرحوم غلام مرتضیٰ بھانڈ لکھنوی ہم ہم ہمّن باپ پوت جھمّن۔ میں اور میرا بھائی اور حجام نائی گھوڑی اور گھوڑی کا بچھڑا مجھ کو تو سرکار جانتے ہیں۔

یہ عالمگیر جرائم پیشہ جب گرفتار ہوتے ہیں تو دھمکیاں دیتے ہیں کہ دیکھنا مجھ سے زیادہ چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں ورنہ میں کھول دوں گا جنہیں.......... کہتے ہیں۔

اور اخبارات کے نمائندوں کا قلم دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے کہ کہیں سچ مچ اس مردود نے کسی کی کھول دی تو میں بیچارہ اخبار نویس خواہ مخواہ مارا جاؤں گا۔

آپ کو یقین نہ آئے تو حاجی قلی مستان شہنشاہِ اسمگلران کی داستان پاستان آجکل کے اخبارات میں پڑھئے۔ گرفتاری کے بعد کیا کیا فرما رہے ہیں۔ کیسی کیسی چبھتی ہوئی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ جو دودھ زہریلا ہو اس کا مکھن زہر قاتل ہی ہوگا۔ انہیں کریم آف سوسائٹی سمجھ کر جس نے چکھا اس کی موت آ گئی۔

راقم الحروف نے تو مکتب اور مدرسہ میں اپنے مولوی صاحب سے قرآنِ کریم کی وہ آیتیں سنی تھیں جن کا مطلب صاف صاف یہ تھا کہ اللہ کے نزدیک وہی اعلیٰ وارفع ہے جو

سوسائٹی میں نسبتاً زیادہ متقی، زیادہ پرہیزگار ہے۔ راقم الحروف نے بھی رمضان المبارک کے روزے کے فلسفہ کے بارے میں مولاناؤں سے یہی سنا تھا کہ اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

نماز کے متعلق بھی خود قرآن سے ایک مولانا صاحب نے بتایا تھا کہ فحشا اور منکر سے نماز انسان کو روک دیتی ہے۔ معاشرہ کو اگر فحاشی اور منکراتِ اخلاق سے بچانا ہو تو نماز پڑھو۔ نماز با جماعت کی تبلیغ مجسم بن جاؤ۔

جدید دور کے صاحبزادوں نے کہا کہ یہ گذرے وقتوں کی باتیں ہیں۔ روپیہ خدائے ثانی ہے۔ العیاذ باللہ اس لئے روپیہ کو اور پیسہ والوں کو معاشرہ میں سب سے بلند مقام حاصل ہونا چاہئے۔ متقیوں کی جگہ خدا کے پاس ہے۔

دنیا میں ان کی جگہ ان کو پیسوں کے مطابق ہی ملے گی۔ اب روپیوں کی دوڑ شروع ہوگئی۔ حرام اور حلال کی اصطلاح تو قرآن کریم نے دی ہے۔

قرآن جو اسی ماہِ مبارک میں نازل ہوا۔ اس دوڑ میں آگے نکل جانے والے حرام اور حلال تقویٰ جیسی چیزوں کو چھوڑ کر آگے بڑھے تھے۔ نتیجہ سامنے ہے۔ بات اسمگلنگ تک جا پہنچی۔ خدا کا شکر ہے کہ پٹنہ کی صوبائی حکومت اور دہلی کی مرکزی حکومت کو یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ بے ایمانی، بددیانتی، رشوت، اسمگلنگ، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی کا خاتمہ اگر فی الفور نہیں ہوا تو پارٹی ختم ہو جائے گی۔ سوسائٹی، سماج، قوم سب فنا کے گھاٹ اُتر جائیں گے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ پٹنہ سے دہلی تک ہر جگہ ایماندار اور دیانتدار قسم کے لوگوں کی تلاش ہے۔ قرآن کا بنایا ہوا معیارِ سیاست جاری و ساری ہو رہا ہے۔

زہریلا دودھ جو سڑکوں پر پھینکا جا رہا ہے، زہریلے مکھن پر جوتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی۔ راقم الحروف نے کسی زمانہ میں ایک اچھی سی غزل کہی تھی جس کا مطلع تھا:

انہیں تلاش ہماری کہاں کہاں نہ ہوئی
یہ عمر دشت میں گذری تو رائیگاں نہ ہوئی

تقویٰ منہ پر یا دل میں

آپ جانتے ہیں کہ غریب و سادہ ورنگیں ہے ''داستانِ عرب'' اور ایک دن اسی داستانِ عرب میں حضرت امیرالمومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ نظر سے گذرا کہ ایک شخص مسجد نبوی میں بہت ہی سوکھے ہوئے چہرہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت امیرالمومنین تشریف لائے۔ اس کے چہرہ کو بغور دیکھا اور پوچھا کہ اے شخص آپ کے چہرے پر ڈھائی کیوں بج رہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟ آپ کچھ فکر نہ فرمائیں سب خیریت ہے اور حضور کی خیریت بھی خداوند کریم سے نیک چاہا ہوں۔ یہ جواب سن کر حضرت سرکار فاروقیت مآب رضی اللہ عنہ (ہماری جانیں قربان) بہت ناراض ہوئے اور اس شخص سے کہا کہ اے مردِ خدا تقویٰ قلب میں ہوتا ہے کہ چہرہ پر؟ چہرہ ہنستا ہوا سرسبز و شاداب رکھو، ورنہ عمر کا دُرّہ تمہاری تربیت کا فرض انجام دینے میں ذرا سی کوتاہی نہیں کرے گا۔ بات اس شخص کی سمجھ میں آ گئی اور مسلمانوں کا معاشرہ سوکھے ہوئے چہروں کی مصیبت سے محفوظ رہ گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو بھی ان زاہدانِ خشک سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ یہ سطریں اس لئے لکھ دی گئیں کہ تقویٰ آپ کے چہرہ کے بجائے آپ کے دل پر نازل ہو۔ واقف آرٹ کا اصل مقصد یہی ہے۔

منکرِ مئے بودن وہم رنگِ مساں زیستن

کا نظریۂ حیات، ہر شخص کی عملی زندگی کا سب سے بڑا رہنما اصول ہو۔

آپ تو فارسی بھول چکے ہیں ورنہ اس موقع پر آپ کو وہ شعر سنا دیتا جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو بہت پسند تھا:

غلط گفتی چرا سجادہ تقویٰ گرد کردی
بہ زہد آلودہ بودم گرنمی کردم چہ می کردم

نجعلها الذین لایریدون علوًا فی الارض و لافسادًا والعاقبة للمتقین!

یہ عالمِ آخرت ہم نے صرف اُنہیں لوگوں کے لئے رکھا ہے جو دُنیا میں نہ بڑا بننے کا ارادہ کرتے ہیں نہ فساد کرتے ہیں اور انجام کی بھلائی صرف متقیوں کا حصہ ہے۔

اللہ رے سادہ لوحی

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں۔ مغرب نے کائناتِ صنعت و حرفت ریاضی وانجینئرنگ کے علوم میں کامیابی کی اعلیٰ منزلیں طے کیں۔ ایجادوں پر ایجادیں کرتا رہا۔ فتوحات پر فتوحات اسے حاصل ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ آج اس منزل پر پہنچ چکا ہے جس کا گذشتہ صدیوں میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ یہ اسباب و وسائل فراہم ہو گئے اور یہ اللہ کی نعمت ہے جس کی ناقدری نہیں کی جاسکتی۔ ان اسباب و وسائل کا ایک انبار آج نگاہوں کے سامنے ہے۔ ان کا مقصدِ وجود یہ ہے کہ کسی کام کا یہ وسیلہ اور آلہ ثابت ہوں۔ بے پایاں قوت حیرتناک سرعت کے ساتھ مقصد براری کے وسائل جو آج حاصل ہیں ان سے بہت کم درجہ کی چیزیں پوری انسانیت کی خوشی کا باعث ہوسکتی ہیں۔ ان سے بہت اسباب و وسائل جو آج حاصل ہیں ان سے بہت کم درجہ کی چیزیں پوری انسانیت کی خوشحالی کا باعث ہوسکتی ہیں۔ ان سے بہت اسباب و وسائل کے ذریعہ انسان کو پر مسرت زندگی بخشی جاسکتی تھی۔ عالمی امن اور سکونِ خاطر بھی حاصل ہوسکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ ان کے ذریعہ محبت و الفت کی فضا دنیا میں قائم ہو جاتی۔ لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے اور تعاون کرتے۔ انسانیت کے مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے خاندان کی شاخیں آپس میں مصنوعی دیواریں منہدم کرسکتیں۔ آج دنیا کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا دنیا کے دوسرے کنارے بسنے والے انسان کی مدد کرسکتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں سن سکتا ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ سکتا

ہے۔ ظالم کو ظلم سے روک سکتا ہے اور مظلوم کی مدد کر سکتا ہے کیوں کہ جہالت اور انسانی کمزوری کی بنا پر جو معذوریاں تھیں وہ ختم ہو گئیں۔ اب تو بھلائی کا کام کرنے والے کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ انسانیت کے بہی خواہ امن کے رہنما آج کس چیز کی کمی کا گلہ کر سکتے ہیں؟ سن لیا آپ نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا وعظ؟ روس، امریکہ اور یورپ کے وحشی درندوں کو مولانا صاحب انسانیت کا درس دے رہے ہیں۔ مادّی تہذیب کی بنیاد ہی جذبۂ تفوق استیلاء ظالمانہ استبداد مفرورانہ قابو چیت پر ہے۔ یہ تو صرف قرآن کریم کی روحانی تہذیب ہے جو اپنے فرزندوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ دوسروں پر مسلط ہونے کا جذبہ اور اپنی سربلندی اور استیلاء کے لئے جنگ و جدل، فساد انگیزی اور فتنہ پروری آخرت میں جنت سے محروم کر دے گی۔

اس لئے ذرا اس کا خیال رہے کہ دوسروں کو معتوب و مقہور یا کمزور کرنا یا خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا غلط استعمال دوسروں کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا دوسروں کا استحصال اور ایکسپلائیٹیشن، یہ ساری باتیں دارِ آخرت کی قیمت پر کی جا سکتی ہیں۔ **تلک الدار الآخرة نجعلها الذین لایریدون علوفی الارض والافسادو العاقبة للمتقین!**

یہ عالمِ آخرت ہم نے صرف انہیں لوگوں کے لئے رکھا ہے جو دنیا میں نہ بڑا بننے کا ارادہ کرتے ہیں نہ فساد کرتے ہیں اور انجام کی بھلائی صرف متقیوں کا حصہ ہے۔ روس، امریکہ اور یورپ تو دور ہیں ذرا ہندوستان عرف بھارت اور پاکستان پھر نئے نئے بنگلہ دیش کے فرعون صفت تکبر مآبوں اور گروپ ڈکٹیٹر شپ کے نشہ میں چور ہوسِ اقتدار کی بدمستیوں، سرِ بازار برہنہ ہو کر جھومنے والوں کو یہ وعظ سنا کر اپنی فصاحت و بلاغت کی داد طلب کر لیجئے۔ مصر کے قطب شہید کا حشر نہ ہو جائے تو لکھنا چھوڑ دوں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سادہ لوحی تو مرزا غالب مرحوم کی سادہ لوحی سے بڑھ گئی۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

خیر مولانا ابوالحسن علی ندوی کو چھوڑیئے آپ سوچئے کہ روزہ جس کا مقصد ہی حصولِ تقویٰ ہے اس آیت کی روشنی میں جو ابھی اوپر پیش کی گئی صحیح طور پر گذر رہا ہے یا دوسروں پر خواہ مخواہ سواری گانٹھنے کا ناپاک ارادہ ابھی قلب کے کسی گوشہ میں موجود ہے؟ استحصال بالجبر کا جذبۂ بے اختیار اب تک نفسِ امارہ کی بلائیں لے رہا ہے؟

خدانخواستہ ایسا ہی ہے تو استغفار پڑھئے، توبہ کیجئے اور ان علماء ومشائخ سے استغنا کیجئے۔ بایں الفاظ کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ جو عالمِ دین سورۂ قصص کی اس آیت کریمہ کو اپنے وعظ میں بالقصد بیان کرتا ہو کہ کہیں اس کے جذبہ تفوق پر تنقید نہ ہو جائے۔ اس کو نذرانہ اور اس کے مدرسہ کو چندہ دینا اس ماہِ مبارک رمضان میں جائز ہے یا نہیں؟ بینو وتو جرو!

سعدی ازم کی ضرورت

بیان کیا جاتا ہے کہ اگلے وقتوں میں ایک بزرگ شیراز میں پیدا ہوئے۔ نام ان کا مصلح الدین اور تخلص سعدی تھا۔ سنتا ہوں انہوں نے عربی زبان، قرآن و حدیث، فقہ، تفسیر، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ، اصولِ تفسیر اور علم کلام مدرسہ نظامیہ بغداد میں پڑھی تھی، وہاں مدرس بھی مقرر ہوئے تھے، بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ انہیں صوفی ازم، درویشی، طریقت اور سلوک اور معرفت کا شوق بھی تھا۔ اس علم کو سعدی شیرازی نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے حاصل کیا تھا۔ یہ بھی بزرگوں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں اور دو کتابیں ایسی زوردار کہ نہ پوچھئے۔ ایک کا نام گلستاں اور دوسرا بوستاں۔ یہ دونوں کتابیں اَب بھی کہیں مل جاتی ہیں۔ پانچ سو برس تک یہ دونوں کتابیں ہندوستان ہی نہیں دنیا کے ہر حصّہ میں جہاں مسلمان موجود تھے، بچوں کو پڑھائی گئیں، جوانوں کو سمجھائی گئیں اور بوڑھوں کے دلوں میں اتاری گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی فارسی اچھی جانتے تھے۔ ایک تو شیراز ان کی جنم بھومی، فارسی ان کی مادری زبان، دوسری بات یہ ہے کہ وہ ذرا جینیس تھے اور جینیس آدمی اپنی مادری زبان زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بول سکتا ہے، لکھ سکتا ہے۔ یہ بھی بہت مشہور بات ہے کہ انہیں لوگوں کے اخلاق سنوارنے اور اخلاقی امراض پر حکیمانہ نسخے تجویز کرانے میں مہارت حاصل تھی۔ اب انہیں لوگ بھول چکے ہیں، بھولتے جارہے ہیں۔ وقت آئے گا جب لوگ

بالکل بھول جائیں گے۔ راقم الحروف اس بھول چوک کو معاف کرتے ہوئے سعدی ازم کے احیاء اور بقا کی ضرورت سمجھتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں گاندھی ازم، نہرو ازم، اندرا ازم، غفور ازم، مارکسزم چلے اور نہ چلے تو سعدی ازم جس کے بغیر کالجوں میں گولیاں چل رہی ہیں۔ انسان درندہ، وحشی، بہائم صفت ہو چکا ہے۔ اس لئے آیئے نعرہ لگائیں سعدی ازم زندہ باد، گلستاں زندہ باد، بوستاں زندہ باد۔

سورۂ والعصر کی ایک دلچسپ اور قابلِ غور تفسیر بالرّائے

مسلمانوں کے خاکستر میں ابھی کیسی کیسی زبردست اور خطرناک چنگاریاں موجود ہیں۔اس کا اندازہ سورۂ والعصر کی اس تفسیر بالرائے سے ہوا جو آج ایک عزیز نے اپنی پختہ خیالی، برق طبعی اور شعلہ مقالی کے ساتھ مجھے سنائی۔ تفسیر بالرائے سے خدا کی پناہ طلب کرتے ہوئے گذارش ہے کہ یہ تفسیر بہت دلچسپ اور قابل غور ہے،ان لوگوں کے لئے جو خدا کی کتاب کو سمجھنا چاہتے ہیں، جن کا شیوہ مذاکرۂ علمیہ اور شعار زندگی تدبر فی القرآن ہے۔ وہ عزیز ٹونی ہوٹل واقع بھنور پوکھر پٹنہ ۴ میں چائے پی کر اپنی تازہ ترین بیڑی سلگا چکا تھا۔ میں چائے کی جرعۂ اولیں کے ساتھ بے شغلی کا فریضۂ حیات انجام دے رہا تھا۔ دفعتہً کانوں میں آواز آئی، واقفؔ صاحب! جو قرآن کو نہیں مانتا کافر ہے۔ خدا کی قسم کافر ہے۔ میں نے عرض کیا بیشک کافر ہی نہیں اکفر ہے۔ مگر کوئی نئی بات فرمائیے۔ وہ عزیز ہنسنے لگا۔ جی ہاں وہی تو عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے چہرہ پر طمانیت آمیز بشاشت تھی۔ بیڑی کے دو طویل کش اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ تقریر شروع ہونے والی ہے۔

میں لوگوں سے اس طرح ملتا ہوں جس طرح گوسائیں تلسی داس نے ہدایت کی ہے۔

تلسی اس جگ آئے کے سب سے ملئے دھائے
نا جانے کس بھیس میں نارائن مل جائے

بُلبلِ شیراز کی نصیحت ہے:

خورش دہ بہ در آج و کبک و حمام

کہ ناگہہ بیفتد ہمائے بہ دام

میں ہمہ تن گوش تھا۔ دوسروں کے کان بھی اس طرف جھک گئے۔ پھر وہ بولنے لگا۔

حضرت یہ بتائیے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے کون سا کام کرتا ہے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں آپ ہی بتائیے، میرا جواب تھا۔

جی ہاں، سب سے پہلے ماں کی چھاتی کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ یہ ہے اس کا فنڈامینٹل رائٹ۔ یہ ہے اس کا فطری بنیاد اور پیدائشی حق۔ دیکھئے سورۂ والعصر میں خدا کہتا ہے:

''واتواصو بالحقِ و تواصو بالصّبر'' اس پیدائشی حق کو یاد رکھنا ہے دوسروں کو یاد دلانا ہے۔ صبر واستقلال کے ساتھ اس کی جدوجہد جاری رکھنا ہے۔

اپنے حق کی حدود سے تجاوز کرنا بھی صبر میں داخل ہے۔ خدا کا حق، رسول کا حق، ہمسایہ کا حق، رہنما کا حق، بیوی کا حق، بچہ کا حق، داعی کا حق، امام کا حق، اسلام نے ان تمام حقوق کی فہرست مرتب کر کے دنیا کو دے دی۔ خدا کی کتاب نے ساری باتیں کھول کر بیان کی ہیں۔

خدا زمانہ کی قسم کھا رہا ہے واقف صاحب! والعصر زمانہ کی قسم زمانہ ہر آن متغیر ہے۔ ہر لمحہ زمانہ کے تغیرات پر نگاہ رکھنی ہے۔ ماضی سے بدگمان، حال سے بیزار، مستقبل سے مایوس، مسلمان کیوں خسارہ میں ہیں۔ وہ بے وقت کی شہنائی ہیں۔ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ زمانہ کے مخصوص علوم وفنون سے بے بہرہ ہیں۔ علم تاریخ کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح داستانِ امیر حمزہ پڑھی جاتی ہے۔ واقعات میں اسباب ونتائج کا رشتہ تلاش کرنے کی زحمت اُن کا دماغ گوارہ نہیں کرتا۔ ''حال'' کا حال یہ ہے کہ اخبارات تک نہیں

پڑھتے۔ اگر پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح کہ اخبار نہیں الف لیلیٰ کے سند باد جہازی کی کہانی ہے۔ اس لئے ان کا مستقبل ہمیشہ مایوسیوں کے بادل سے ڈھکا رہتا ہے۔ یہ مسلمان اِنَّ الانسان لفی خسر کی سچی تصویر ہیں۔ سلسلہ تقریر جاری تھا۔ مسلمان وہ ہے جو زمانہ کے ہر تغیر کو عمل صالح کا پیغام سمجھے۔ زمانہ کی ہر تبدیلی اس کو خدا پر، خدا کے رسول پر، خدا کی کتاب پر دعوت ایمان دیتی ہے۔ ہر لمحہ اس کو اپنے ایمان کا جائزہ لینا چاہئے۔ تجدید ایمان کرنی چاہئے، ہمہ دم کلمہ طیب کا ورد اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ ورنہ وہ دہریہ، ملحد، کمیونسٹ کا فرزندیق ہو کر گمراہی کی موت مر جائے گا۔ اس کو عملِ صالح اور غیر صالح میں کوئی فرق و امتیاز نظر نہ آئے گا۔ پھر عملِ صالح میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی داخل نہیں، معاشی فرائض ہیں، سیاسی فرائض ہیں۔ انہیں وقت پر زمانہ کے حالات کو سامنے رکھ کر کہیں ہم آہنگی، کہیں مقابلہ، کہیں ترمیم، کہیں تنسیخ کے ساتھ شرائط ارکان و آداب کی پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجام دینا ہے۔ فرمائیے واقفؔ صاحب! کیا میں وعظ کہہ رہا ہوں۔ تقریر ختم ہو چکی تھی۔ سامعین کا مختصر سا مجمع اس کی عالمانہ بصیرت کا قائل ہو چکا تھا۔ میرے ذہن میں کسی کا یہ شعر گونج رہا تھا:

زباں منصور کی ہے بولنے والا ہے پردہ میں
اناالحق صاف ہے آواز پہچانی نہیں جاتی

میں نے اس عزیز کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے خدا کی کتاب کی طرف مجھے نئے انداز سے دعوت دی۔ علمائے کرام کی اس تفسیر کے متعلق اگر کچھ ارشاد فرمائیں تو راقم الحروف ان چیزوں کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے میں فخر محسوس کرے گا۔ مصر کے مفتی عبدہٗ مرحوم اس دور میں تفسیر بالرائے کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ ارادہ ہے کہ سورۂ والعصر کے متعلق ان کی تحقیق دیکھ لوں۔ مولانا عبدالحمید فراہی مرحوم بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے اس سورہ کی کیا تفسیر لکھی ہے؟

علامہ ابن قیم نے سورۂ والعصر کی مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ اب اس کو بھی پڑھنا پڑا۔ معتزلی فرقہ کی تفسیر کشاف کی ورق گردانی بھی فرض ہے۔ پھر فرقہ اہل قرآن کے طلوعِ اسلام والے حضرت پرویز کی نکتہ سنجیاں بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحق حقانی اور سب سے آخر میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے سورۂ والعصر کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، اب بغور دیکھنا ہے۔ اس عزیز نے خدابخش خاں مرحوم کی اورینٹل پبلک لائبریری میں ایک ہفتہ تک مجھے کتابوں کے مقبرہ میں دفن کرنے کا بندوبست کرایا۔

azameen-e-Waqif Azeem Abadi

Edited by

Akbar Imam Kashif



پورا نام سیّد شاہ محمد اکبر امام تخلص کاشفؔ تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۵۸ء ہے۔ موصوف علامہ واقف عظیم آبادی مرحوم کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ ہفتہ وار ''طشت از بام'' کے نائب مدیر رہے اور ۱۹۹۴ء میں علامہ واقف عظیم آبادی میموریل سوسائٹی قائم کی۔ انڈین پیولس تھیٹر ایسوسی ایشن کی بہار شاخ سے برسوں وابستگی رہی۔ اسی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ۱۹۸۰ء میں حیدر آباد میں متعدد ڈراموں کے بین الاقوامی مقابلہ میں بہترین اداکاری کے لیے آندھرا پردیش کے گورنر ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی کے ہاتھوں انعام حاصل کیا۔

بہار اور بنگال کی ادبی انجمنوں سے والہانہ وابستگی ہے۔ ''علامہ واقف عظیم حیات اور خدمات'' (زیرِ طبع) کے مرتب ہونے کے علاوہ مرحوم کے مجموعۂ کلام ''راز ہائے پردہ'' کے مرتب بھی ہیں۔

جہان آباد اور نواح میں اردو شعر و ادب کی ترقی کے لیے کوشاں رہے ہیں اور ک ایک فعال تنظیم ''اردو ہندی ساہتیہ سنگم'' کے قیام میں قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔ ان ک سرگرمیاں جاری ہیں۔